قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۷ شمارہ: ۵

جمادی الاولیٰ: ۱۴۴۵ھ - دسمبر: ۲۰۲۳ء

قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۶۵۰ روپے

مُدیر / مُدیرِ مسئول

مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر

مولانا سیّد احمد یوسف بنوری

مُدیرِ معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر

عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-0101900 برانچ کوڈ: 00816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: 92-21-34919531 +

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

فلسطین اسرائیل جنگ اور ہماری ذمہ داریاں	۳	سید سلیمان یوسف بنوری
مسجد اقصیٰ اور فلسطین - دردمندانہ گزارشات	۱۳	

مقالات ومضامین

مکاتیب حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاںؒ بنام حضرت بنوریؒ	۱۴	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
گناہوں کی اقسام اور توبہ کے فضائل وآداب!	۱۹	حضرت مولانا محمد عبدالحلیم چشتیؒ
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مخالفت کیوں؟! ... چند اسباب	۳۱	علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ
بلاغاتِ امام مالکؒ ... تعارف اور اسنادی حیثیت	۳۶	مولانا محمد ظریف
حنفی منہجِ افتاء ... تعارف واہمیت	۳۹	مفتی عبیدالرحمٰن
عقلی فنون پڑھنے کے فائدے	۴۶	مفتی محمد طارق محمود
تعوُّذات ... تعارف، اہمیت، فوائد	۵۶	مولانا عبدالستار

دار الافتاء

واٹس ایپ پر اجتماعی ایصالِ ثواب کے لیے گروپ بنانا	۶۰	ادارہ

نقد ونظر

احکام المعذورین (معذور اور مریض کے احکام)	۶۴	ادارہ

بصائر و عبر

فلسطین اسرائیل جنگ اور ہماری ذمہ داریاں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

گزشتہ ماہ اکتوبر ۲۰۲۳ء کی ۷؍تاریخ سے تاحال فلسطین کے باشندوں خصوصاً اہالیانِ غزہ پر اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی جاری ہے۔ نہتے بچوں، بوڑھوں، خواتین حتیٰ کہ پناہ گزین کیمپوں میں موجود معصوم انسانوں اور ہسپتالوں میں موجود زخمیوں اور بیماروں پر بمباری کی جارہی ہے، جس سے نو ہزار سے زائد مسلمان شہید ہوچکے ہیں اور چھبیس ہزار کے قریب زخمی ہیں۔ غزہ کے چاروں طرف محاصرہ کی بنا پر اہلِ غزہ پر خوراک، پانی، ایندھن اور ضروریاتِ زندگی کو تنگ کردیا گیا ہے، جس کی بنا پر نہ صرف عالمِ اسلام کی عوام بلکہ انصاف پسند مغربی اقوام بھی سراپا احتجاج ہیں، لیکن اقوامِ متحدہ سمیت مسلم حکمران مذمتی قراردادوں کے پاس کرانے کے سوا کہیں آگے نہیں بڑھ رہے۔ ان حالات میں عالمِ اسلام کی عوام اور حکمرانوں کی کیا ذمہ داری بنتی ہے، اس پر جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری زید مجدہٗ سے سوال کیا گیا، جس کا جواب روزنامہ جنگ میں ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' کے عنوان کے تحت شائع ہوا، اس جواب میں بہت ہی اہم، مقصودی اور بنیادی باتوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ قارئینِ بینات کے افادہ کی غرض سے بصائر وعبر کے طور پر انہیں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

سوال

حماس اسرائیل جنگ اور اس پر مسلمان ملکوں کے رویے کی وجہ سے دل بہت پریشان اور غمگین ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟ آپ سے درخواست ہے کہ میری گزارش کو فوقیت دیں اور اپنے کالم میں پہلے میری درخواست کا جواب دیں؛ کیوں کہ یہ صرف مجھ اکیلے کا سوال نہیں ہے۔

جواب

فلسطین کے حالات کی وجہ سے ہر انصاف پسند اور صاف دل اور زندہ ضمیر رکھنے والا شخص رنجیدہ ہے۔ ایک مومن تو اپنے دل میں درد، جگر میں سوز اور کلیجے میں جلن محسوس کرتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ اسلام نے جس درد و محبت کے رشتے میں ہمیں پرو دیا ہے، اس کی رو سے مشرق میں کھڑے شخص کے پاؤں میں اگر کانٹا بھی چبھے تو مغرب میں کھڑے شخص کو اپنے دل میں اس کی چبھن محسوس کرنی چاہیے۔ ایک کی مصیبت پر دوسرے کو تڑپ جانا چاہیے اور ایک کی چوٹ کی کسک دوسرے کو اپنے سینے میں محسوس ہونی چاہیے۔ اس کیفیت میں شدت اس وقت آجاتی ہے جب وہ خود آگے بڑھ کر مظلوم کی مدد اور ظالم کا ہاتھ روکنا چاہ رہے ہوں، مگر بے بس ہوں اور جن کی اصل ذمہ داری ہو، وہ اس کا احساس نہ رکھتے ہوں، ایسے موقع پر ان کی حالت وہ ہوجاتی ہے جو امام سبکی علیہ الرحمہ پر گزری تھی اور اس حالت میں ان کے قلم سے یہ درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکلے تھے کہ: ''ہائے! ہاتھوں کا کام فریاد کرنا نہیں، بلکہ گریبان پکڑنا ہے، مگر افسوس کہ یہ ہاتھ ان تک پہنچ نہیں سکتے ہیں۔'' جن کے ہاتھ ان تک پہنچ سکتے ہیں، جنہیں عالمِ اسلام اور ستاون اسلامی ملکوں سے یاد کیا جاتا ہے، اُن کی زبانیں گنگ، ہاتھ شل، اعضاء مفلوج اور ضمیر مردہ ہو چکے ہیں، چنانچہ عملی تعاون اور مدد تو کجا، کہیں سے ان مظلوموں کی حمایت میں کوئی طاقت ور اور توانا آواز بھی نہیں اُٹھ رہی ہے۔ اگر کہیں کسی گوشے سے کوئی نحیف و نزار صدا سنائی بھی دیتی ہے تو رسمی جملوں تک محدود ہوتی ہے، حالانکہ ان کو آوازوں اور قراردادوں کی ضرورت نہیں، بلکہ ٹینکوں کے مقابلے میں ٹینکوں کی اور میزائلوں کے مقابلے میں میزائلوں کی ضرورت ہے۔ اسرائیل کی حمایتی ریاستوں نے صرف اس کے حق میں آواز بلند نہیں کی ہے، بلکہ بحری بیڑے اور عسکری ساز و سامان بھیجا ہے۔

عالمِ اسلام اگر فلسطینیوں کے ساتھ یہ رویہ رکھ کر سمجھتا ہے کہ ان کی اُفتاد ہے، اُن پر پڑی ہے اور وہ جھیل لیں گے اور گزر جائے گی تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ:

'' قَالَ رَبُّكَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ لَأَنْتَقِمَنَّ مِنَ الظَّالِمِ فِيْ عَاجِلِهٖ وَآجِلِهٖ، وَلَأَنْتَقِمَنَّ مِمَّنْ رَأَى مَظْلُوْمًا فَقَدَرَ أَنْ يَّنْصُرَهٗ، فَلَمْ يَفْعَلْ. ''

(المعجم الأوسط للطبراني، ج:۱، ص:۱۵، باب الألف، من اسمه أحمد، ط:دار الحرمين - القاهرة)

''اللہ عز وجل فرماتا ہے کہ مجھے میری عزت وجلال کی قسم! میں جلد یا بدیر ظالم سے بدلہ ضرور لوں گا اور اُس سے بھی بدلہ لوں گا جو باوجود قدرت کے مظلوم کی مدد نہیں کرتا۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ:

'' اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلاَ يُسْلِمُهٗ. ''

(صحيح البخاری، كِتَاب الْمَظَالِمِ، بَابُ لاَيَظْلِمُ الْمُسْلِمُ الْمُسْلِمَ وَلاَ يُسْلِمُهُ، رقم الحديث: ۲۴۴۲)

یعنی ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، مسلمان نہ دوسرے بھائی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ ہی اسے اوروں کے سپرد کرتا ہے۔''

اور مسلم شریف میں ہے کہ:

''وَلَا يَخْذُلُهٗ'' (صحيح مسلم، ص:۱۹۸۶، ج:۴، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله، ط:دار إحياء التراث العربي)

یعنی ''اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا ہے۔''

مسلمانوں کو اگر عالم اسلام سے امید ہے تو عالمِ اسلام کی نظریں خصوصاً پاکستان کی طرف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اگر اسرائیل کا کوئی حقیقی حریف اور اصل مدِمقابل ہے تو وہ پاکستان ہے۔ دونوں کی بنیاد مذہبی ہے اور دونوں کی عمریں تقریباً برابر ہیں اور دونوں ایٹمی قوتیں ہیں۔

پاکستان پر کسی اور سے زیادہ یہ ذمہ داری اس وجہ سے بھی عائد ہوتی ہے کہ ہمارے آئین کا آرٹیکل: ۴۰ عالمِ اسلام سے مضبوط رشتہ استوار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ بانیِ پاکستان کے الفاظ ہیں کہ:

''پاکستان دنیا کی مظلوم اور کچلی ہوئی اقوام کو اخلاقی اور مادی امداد دینے سے کبھی بھی نہیں ہچکچائے گا۔''

اور اقوامِ متحدہ کے منشور میں درج شدہ اُصولوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے کئی اسلامی ملکوں کی آزادی کے لیے اَنتھک کوششیں کی ہیں اور ایشیا، افریقا، اور لاطینی امریکا کی مظلوم قوموں کا ساتھ دیا ہے۔

فلسطین کے ساتھ بانیانِ پاکستان کا رشتہ بطورِ خاص اسی طرح رہا ہے جیسے کشمیر کے ساتھ رہا ہے، انہوں نے کشمیر کی طرح فلسطین کے درد کو بھی اپنا درد سمجھا اور دونوں ہی تحریکوں میں بدل و جان حصہ لیا ہے، بلکہ ہمدردی کا یہ تعلق جانبین سے رہا ہے۔ فلسطین کے اکابر نے ہمیشہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے موقف کی حمایت کی اور کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی تائید کی، خصوصاً قیامِ پاکستان کے زمانے میں مفتی اعظم فلسطین کے عہدے پر فائز مفتی امین حسینیؒ نے ۱۹۵۱ء میں کشمیر کے حوالے سے کراچی میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی اور بذاتِ خود آزاد کشمیر جا کر کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی حمایت کی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی فلسطین کے بارے میں فکرمندی ان کے کلام اور خطبات سے واضح ہے اور بانیِ پاکستان کی موجودگی میں مسلم لیگ نے قرارداد پاس کی کہ عالمِ اسلام بیت المقدس کو غیر مسلموں سے آزاد کرنے کے لیے مشترکہ حکمتِ عملی وضع کرے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بانیِ پاکستان نے امریکی صدر کے نام ایک خط میں اسرائیل کے قیام کو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی قرار دیا اور امریکی صدر سے اپیل کی کہ وہ فلسطین کی تقسیم کو روکیں۔ بعدازاں آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری اجلاس منعقدہ ۱۴اور ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء میں فلسطین کی تقسیم کو مسترد کیا گیا۔

ان ابتدائی گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسرائیل ایک ریاست ہے اور ریاست کا ہاتھ افراد نہیں، بلکہ ریاست روک سکتی ہے؛ اس لیے پاکستان سمیت تمام مسلمان ملکوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ان حالات میں مسلمان ملکوں اور عوام کو چاہیے کہ وہ درج ذیل امور کا اہتمام کریں:

①- سب سے پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع اور انابت کر کے اسی سے مدد مانگیں اور خوب دعائیں کریں؛ کیوں کہ وہی مسلمانوں کا حقیقی حامی و ناصر اور معین و مددگار رہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

’’وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ‘‘ (آلِ عمران، آیت نمبر: ۱۲۶)

’’فتح تو کسی اور کی طرف سے نہیں، صرف اللہ کے پاس سے آتی ہے جو مکمل اقتدار کا بھی مالک ہے اور تمام تر حکمتوں کا بھی مالک ہے۔‘‘

اسی سورت کی ایک سو پچاسویں آیت میں ہے کہ:

’’بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰـكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ‘‘ (آلِ عمران، آیت نمبر: ۱۵۰)

’’(یہ لوگ تمہارے خیرخواہ نہیں ہیں) بلکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔‘‘

یہ بھی ارشاد ہے کہ:

’’إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ‘‘ (آل عمران، آیت:۱۶۰)

’’اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔‘‘

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب آسمانی طاقت ساتھ لے کر چلے ہیں تو بڑی بڑی طاقتیں ان کے سامنے خاک کے گھروندے ثابت ہوئے ہیں۔ اسرائیل طاقت ور سہی مگر خدا سے زیادہ طاقتور نہیں اور اس کی طاقت یہی ہے کہ مٹھی بھر جماعت نے اس کی دھاک خاک میں ملادی ہے، وہ شدید رسوا اور ذلیل ہوا ہے، اس کی ہیبت زائل ہوچکی ہے، اس پر لرزہ طاری ہے اور وہ حواس باختہ ہوچکا ہے۔ چند دنوں کی جھڑپوں میں اس نے شدید جانی، مالی اور عسکری نقصان اُٹھایا ہے، اب وہ نہ سکونت کے اعتبار سے محفوظ رہا ہے اور نہ ہی سرمایہ کاری کے لیے قابلِ اعتماد ٹھہرا ہے، اس کے ریڈاروں، کیمروں، سینسروں، مضبوط دیواروں، آہنی باڑوں اور جدید ٹیکنالوجی کے باوجود مجاہدین اسے ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

’’وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ كَمَا تَأْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا‘‘ (سورۂ نساء، آیت:۱۰۴)

’’اور تم ان کافر دشمنوں کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو ان کو بھی اس طرح تکلیف پہنچی ہے جیسے تمہیں پہنچی ہے اور تم اللہ سے اس بات کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں اور اللہ علم کا بھی مالک ہے اور حکمت کا بھی مالک۔‘‘

۲- دوسری چیز خدا پر یقین اور اعتماد ہے۔ یقین وہ ہتھیار ہے جو حالات کے دھارے کو بدل دیتا ہے، طوفانوں کا رخ موڑ لیتا ہے۔ مبصرین کے اندازوں کو غلط ثابت کردیتا ہے اور انقلاب برپا کردیتا ہے۔ تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کو سر کی آنکھوں سے نظر آرہا تھا کہ آگے سمندر اور اس کی طغیانی ہے اور پیچھے فرعون اور اس کا لاؤلشکر ہے؛ اس لیے پکار اُٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے، مگر موسیٰ علیہ السلام نے پورے جزم اور یقین سے کہا:

’’كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ‘‘ (الشعراء:۶۲)

’’ہرگز نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے جو مجھے ضرور راستہ دے گا۔‘‘

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کو معلوم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی یقین کی بدولت کسی جتھے اور جماعت اور کسی مادی قوت اور منصب کے بغیر تن تنہا اس وقت کی پوری دنیا کے باطل سے جاٹکرائے اور اسے پاش پاش کردیا۔ غزوۂ خندق میں ایسے موقع پر جب مسلمان فاقہ کشی کا شکار ہیں اور ایسے حالات میں کہ جب زندہ بچ جانے کی اُمیدیں کم ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ تم ایران اور شام کے محلات کو فتح کروگے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ولولہ وعزم اور عشق ویقین تھا کہ لشکرِ اسامہ کو روانہ فرمایا، مرتدین سے قتال کیا اور دو بڑی سلطنتوں سے جہاد کیا، حالانکہ مہاجرین اور انصار کے سب بزرگوں کی رائے اس کے خلاف تھی۔

آج بھی عقل کا فتویٰ اور سیاست کا فیصلہ یہ ہے کہ جابر وقاہر اور سنگدل و وحشی اسرائیل کے خلاف کسی مہم جوئی سے باز رہا جائے، مگر جس خدا نے اس وقت مدد ونصرت کی اور مادی سوچ کو ناکام اور اندازوں کو غلط ثابت کیا، وہ خدا آج بھی اسی قدرت اور طاقت کے ساتھ موجود ہے، مگر ایسے یقین کے لیے شرط ہے کہ وہ کسی ضد اور نفسانیت یا بیرونی امداد اور طاقت کے سہارے کی بنا پر نہ ہو، ورنہ انجام وہ ہوتا ہے جو اکثروں کے ساتھ ہوا ہے۔

۳- یہ بھی ضروری ہے کہ جو اقدام ہو وہ مشورے اور مناسب تدبیر کے ساتھ ہو۔ ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ یقین کی بنیاد حق اور صداقت ہو اور صاحبِ یقین مخلص اور عملِ صالح کی دولت سے مالا مال ہو۔

۴- اس کے بعد کا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق ہو۔ اسی مقصد کے لیے اسلام اجتماعیت کو ضروری قرار دیتا ہے، امیر کی اطاعت بھی اس لیے ضروری ہے کہ امارت قائم رہے، اور امارت کی ضرورت مرکزیت کے لیے ہے، اور مرکزیت کی ضرورت اجتماعیت کے لیے ہے۔ عالمِ اسلام جو جغرافیائی محلِ وقوع رکھتا ہے، اس کی بنا پر وہ بے پناہ عسکری، اقتصادی اور سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت صرف ایک مقصد پر متفق ہونے کی ہے اور نقطۂ اتحاد کوئی نسلی، لسانی، قومی اور جغرافیائی اشتراک نہ ہو، بلکہ صرف مذہبِ اسلام ہو۔

مسلمانوں کی تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جب کبھی ان کو آزادی ملی ہے یا ان کی کوئی بڑی تحریک کامیاب ہوئی ہے یا انہوں نے کوئی انقلاب برپا کیا ہے تو اس کے پسِ پشت مذہب کا عامل تھا، خود تحریکِ پاکستان کا جائزہ لیجیے، قومیتوں کے اختلاف کے باوجود اس کی کامیابی بھی تب ہی ممکن ہوئی جب

''پاکستان کا مطلب کیا: لا إلٰه إلا الله '' کے نعرے کو بنیاد بنایا گیا۔

⑤- ان اوصاف کے ساتھ ایک مزید وصف صبر واستقلال کا ہے، جس کا مطلب ہے کہ مسلمان اپنے عزم کے پکے اور ارادوں میں پختہ ہوں اور وہ ایک جگہ جمے اور ڈٹے ہوئے ہوں اور حالات کی سنگینی کی وجہ سے نہ ان کے ارادے متزلزل ہوں اور نہ ہی پائے استقامت میں جنبش پیدا ہو۔ جو لوگ اس طرح صبر واستقلال کا مظاہرہ کر لیتے ہیں، پھر وہ محکوم، مغلوب، مجبور اور مقہور نہیں رہتے ہیں، بلکہ دنیا کی امامت وقیادت کا تاج ان کے سر سجا دیا جاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

''وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ'' (سورۂ سجدہ: ۲۴)

''اور ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو، جب انہوں نے صبر کیا، ایسے پیشوا بنا دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔''

اب تک مسلمانوں کی جن صفات کا بیان ہوا وہ سب شرعی صفات ہیں اور یہی مسلمانوں کی اصل طاقت ہیں، اس طاقت کا جب کبھی بھی مادی طاقت سے تصادم ہوا ہے، غلبہ ان ہی کو حاصل رہا ہے۔ بدر اور اُحد اور بعد کے اسلامی معرکے ان ہی کی بنیاد پر لڑے گئے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ مادی وسائل جمع نہ کیے جائیں اور نہ ان سے کام لیا جائے۔ نماز پانچ وقت ہے اور روزہ ایک مہینہ ہے اور حج ایک مرتبہ ہے، مگر دشمن کے مقابلے کے لیے تیاری کو قرآن کریم نے غیر محدود رکھا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان وسائل کی کثرت اور اس میں برتری حاصل ہونے تک جہاد کے فریضے کو موقوف نہ رکھیں؛ کیوں کہ وسائل کے لحاظ سے عمومی معیار یہ ہے کہ کافروں کو مسلمانوں سے دس گنا زیادہ وسائل میسر ہوں گے اور اگر مسلمان بہتر پوزیشن میں ہوئے تو پھر بھی مسلمانوں کو دوگنی تعداد اور وسائل کا سامنا ہوگا۔ اگر وسائل اور دشمن جیسے وسائل یا ان کے برابر وسائل یا ان سے برتر وسائل ضروری ہوتے تو اسلامی غزوات کی کبھی نوبت ہی نہ آتی اور عہدِ حاضر اور قریب میں اسلامی تحریکات کبھی کامیاب نہ ہوتیں۔ بہرحال وسائل سے انکار نہیں، بلکہ ان کی ترغیب ہے اور ترغیب بعض صورتوں میں وجوب اور فرض کے درجے میں ہے، مگر دشمن جیسے وسائل کی دستیابی تک جہاد کو موقوف رکھنا دوا کھانے کے لیے صحت کا انتظار کرنا ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمان ممالک جب تک کوئی عملی قدم نہیں اُٹھاتے ہیں، اس وقت تک ایک عام مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مؤمنانہ صفات سے اپنے آپ کو موصوف رکھے، تمام گناہوں

خصوصاً ان گناہوں سے اجتناب کرے جن کی وجہ سے نہ صرف نصرتِ الٰہی رک جاتی ہے، بلکہ خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

دعا کا ہتھیار ہر مسلمان کے پاس ہے اور اس کے لیے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں، مؤمن کی آہِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی میں خدا تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا يُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ يَدُرَّ لَكُمْ أَرْزَاقُكُمْ؟ تَدْعُوْنَ اللّٰهَ فِيْ لَيْلِكُمْ وَنَهَارِكُمْ، فَإِنَّ الدُّعَاءَ سَلَاحُ الْمُؤمِنِ.'' (مسند أبي يعلي، ص:٣٠٨، ج:٣، مسند جابر بن عبد الله رضي الله عنه، ط:دار الحديث، القاهرة)

''کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں جو تمہارے دشمنوں (کے ظلم وستم) سے تمہیں نجات دے اور تمہیں بھرپور روزی دلائے، وہ عمل یہ ہے کہ اپنے اللہ سے دن رات دعا کیا کرو؛ کیوں کہ دعا مؤمن کا ہتھیار ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''الدُّعَاءُ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ، وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ، فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللهِ بِالدُّعَاءِ.'' (المستدرك علي الصحيحين للحاكم، ص:٦٦٦، ج:١، كتاب الدعاء، والتكبير، والتهليل، والتسبيح والذكر، ط: دار الكتب العلمية)

''دعا ان حوادثات اور مصائب سے بھی چھٹکارا دلاتی ہے جو حوادثات اور مصائب نازل ہو چکے ہیں اور ان سے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے، لہٰذا اللہ کے بندو! دعا کا اہتمام کیا کرو۔''

پھر وہ دعا جو اپنے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں کی جائے وہ تو جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ أَسْرَعَ الدُّعَاءِ إِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ.'' (سنن أبي داؤد، ص:٥٦٣، ج:١، كتاب الصلاة، باب الدعاء بظهر الغيب، ط:المطبعة الأنصارية بدهلي- الهند)

''بے شک جلد قبول ہونے والی دعا وہ ہے جو غائب کی غائب کے لیے ہو۔'' یعنی کسی کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں دعا کی جائے۔

امت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعاؤں اور نمازوں کا اہتمام جاری رکھیں، اس سے اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت ہوگی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ إِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ.'' (صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب، ج:٤، ص:٣٦، رقم الحديث:٢٨٩٦)

یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس اُمت کے ضعفاء وکمزور لوگوں کے بسبب اور ان کی دعاؤں، نمازوں اور اخلاص کی بدولت اس امت کی مدد فرماتے ہیں۔''

۶- دعا کے ساتھ ان کی مالی اور اخلاقی مدد کرنا ہے۔ اصل اعانت تو وہ ہے جس کا نقشہ مسلمان سپہ سالار طارق بن زیاد نے پیش کیا تھا کہ جب ایک عیسائی حکمران راڈرک نے اپنے گورنر کی معصوم بچی سے زیادتی کی اور اس گورنر نے اپنے ہمسایہ اور ہم منصب مسلمان گورنر موسیٰ بن نصیر کو مدد کے لیے خط لکھا اور جواب میں طارق بن زیاد نے اسپین کو فتح کرکے اسے امن کا گہوارہ بنادیا۔ اصل اعانت وہ ہے جس کا مظاہرہ حجاج بن یوسف نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو یہاں بھیج کر کیا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں کے ترجمان اسی کی دہائیاں دے رہے ہیں اور اللہ کا کلام مسلمانوں سے اسی کا طالب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا'' (سورۂ نساء، آیت:۷۵)

''اور اے مسلمانو! تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لائیے جس کے باشندے ظلم توڑ رہے ہیں، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کردیجیے، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کردیجیے۔''

مدد کا حق اسی طریقے سے ادا ہوسکتا ہے، لیکن اگر اس طرح ممکن نہیں ہے تو ان کی مالی مدد واعانت ضرور کرنی چاہیے، مسلمان اہلِ ثروت کے پاس یہ جہاد بالمال کا سنہرا موقع ہے۔

۷- اس کے ساتھ ان حالات میں چند اور امور کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ اہلِ علم کو چاہیے کہ عام مسلمانوں کو فلسطین کی تاریخی، مذہبی اور سیاسی اہمیت سے آگاہ کریں۔ فلسطین کا قضیہ حقیقت

میں کیا ہے؟ اور مسلمانوں کو اس بارے میں حساس ہونے کی ضرورت کیوں ہے؟ اس بارے میں نوجوان نسل کو اصل حقائق سے آگاہ کرنا چاہیے۔ یہود کے جرائم اور نفسیات کیا ہیں؟ اور قرآنِ کریم کی سب سے بڑی سورت میں ان کو کیوں برائی کا منبع، اس کا مصدر اور موجد قرار دیا گیا ہے؟ موجودہ دور میں اسرائیل، امریکا اور یورپ کا گٹھ جوڑ کیوں ہے؟ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہے؟ اور حماس اپنی موجودہ روش میں کیوں حق پر ہے؟ ان حقائق سے نئی نسل کو روشناس کرانا چاہیے۔ جو لوگ میڈیا سے وابستہ ہیں یا کم از کم سوشل میڈیا استعمال کرتے ہیں، ان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جھوٹی خبروں اور غیر مصدقہ اطلاعات کو آگے نہ بڑھائیں، بلکہ دشمن کے پروپیگنڈے کو بے نقاب کریں۔ زمانہ جنگ میں دشمن کا وطیرہ رہا ہے کہ افواہوں کا بازار گرم کردیتا ہے؛ اس لیے چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے، منافقین نے تہمت کے لیے زمانۂ جنگ ہی کا انتخاب کیا تھا اور بعد کی تاریخ میں بھی زمانۂ جنگ میں ہی مسلمانوں کی طرف بے سروپا باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ آخر میں اپنے مسلمان رہنماؤں سے کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے مسلمان عوام میں ایمان وخلوص اور جوش وجذبہ پایا جاتا ہے، یہ جذبات ہماری طاقت ہیں اور برسرِ اقتدار طبقہ چاہے تو ان جذبات کو درست موقع پر درست انداز سے کام میں لاسکتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ محیر العقول کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں، جن سے دیگر قومیں محروم ہوچکی ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی وناصر ہو! فقط واللہ اعلم

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علٰی آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

مسجد اقصیٰ اور فلسطین - دردمندانہ گزارشات

آسمانی تعلیمات کے مطابق اُمتِ مسلمہ کے تمام افراد آپس میں بھائی بھائی اور ہر قسم کے دکھ درد میں ایک جسم کی مانند ہیں، جسم کے کسی بھی حصے میں اگر تکلیف ہو تو اس کا درد پورے بدن میں محسوس ہونا فطری تقاضا ہے، اسی دینی اُخوت، انسانی ہمدردی اور فطری تقاضے کے تحت اس وقت پوری اُمتِ مسلمہ قبلۂ اول مسجد اقصیٰ اور فلسطین کے مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہے، اس موقع پر رجوع الی اللہ، توبہ واستغفار اور اَعمالِ صالحہ کی مزید ضرورت ہے، عمومی دعاؤں کے ساتھ ساتھ ائمہ مساجد سے گزارش ہے کہ وہ قنوتِ نازلہ کا اہتمام بھی کریں۔

اُمتِ مسلمہ کا دینی واخلاقی فرض ہے کہ وہ فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا ہر ممکن تعاون کریں، ان کی نصرت وحمایت کے لیے اُمت کے تمام طبقے اپنی حیثیت اور وسعت کے مطابق ہر ہر سطح پر بھرپور کردار ادا کریں، اپنے ملکی قانون اور دستور کے دیے گئے حقوق کے تحت اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی وسعت وقدرت کے تحت اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی دادرسی کے لیے اپنے وسائل بروئے کار لائیں اور مسلمان حکمرانوں پر شرعاً واخلاقاً لازم ہے کہ بیت المقدس کے مظلوم مسلمانوں کی نصرت وحمایت کے لیے میدانِ عمل میں آئیں، اور اُن کے تحفظ، دفاع اور بحالی کے لیے اپنی دفاعی طاقت، انسانی حقوق اور سفارتی اثر ورسوخ کا بھرپور استعمال کریں۔

اسلامی دنیا کے تمام دینی، سیاسی اور صحافتی طبقوں پر لازم ہے کہ وہ متحد ہوکر فلسطینی مسلمانوں کے لیے یک جان اور ایک آواز بنیں، اور ہر ہر سطح پر فلسطینی مسلمانوں کے تحفظ اور دفاع کے فریضے کا شعور بیدار کریں، اور تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ممکنہ حد تک قابلِ اعتماد ذرائع سے فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ بھرپور مالی تعاون کریں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلسطین وکشمیر کے مظلوم مسلمانوں اور تمام مظلوم مسلمانوں کی مدد ونصرت فرمائے، اور اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو!

والسلام

سید سلیمان یوسف بنوری حسینی

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیب حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاں رحمۃ اللہ علیہ

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۸/مارچ ۱۹۵۹ء

ذو المجد والكرم، الأخ المحترم، حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب حفظكم الله، ونفع بكم الدين والعلم، ورضي عنكم وأرضاكم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نامہ گرامی مورخہ ۲۲/فروری نے مشرف فرمایا، مشرقی پاکستان کے دورۂ علمی کے حالات معلوم ہوکر -ماشاءاللہ- خوشی ہوئی، خیریتِ مزاجِ گرامی کی اطلاع پاکر الحمدللہ اطمینان ہوا، الحمدللہ یہاں عافیت ہے۔

①- جزاکم اللہ! جدید تدوینِ فقہ کے متعلق آپ کا مشورہ مفید معلوم ہوا، جس بنا پر مولانا محمد طاسین صاحب سلمہٗ کو عرض کردیا گیا ہے کہ وہ آپ کی رہنمائی سے اس کا مطبوعہ مواد، ممالکِ اسلامیہ سے منگوا کر مہیا کرلیں، آپ انہیں ضروری ہدایات ونشان دہی دے کر نوازیں، ولكم الفضل والحسنات! اس کے لیے کسی مستعد عالم کا انتخاب بھی اگر پہلے سے ہوجائے تو مناسب ہے۔

②- ''العرف الشذي'' کے بارے میں آپ کے قصدِ جدید سے مسرت ہوئی، موجودہ ''العرف الشذي'' بہت ہی ناقص ہے، اور موجودہ صورت میں اس کو دوبارہ شائع کرنے کے لیے بہت ہی تردد ہے۔ اگر اس کے خلاؤں کو پُر نہ کیا گیا اور اس کی نئی تشکیل نہ ہوسکی تو تعلیقات، اس کمزور بِنا (بنیاد) پر قوی عمارت کھڑی کرنے کے مرادف ہوگا، جس کے لیے طبیعت فکرمند ہے۔ اگر پہلی گزارشیں قبول پالیتیں تو ترمذی کے امالی جمع کرکے ہلکی معاون تعلیقات کے ساتھ شائع کردیے جاتے، اور ''معارف السنن'' کو متن ''جامع ترمذی'' پر یا علیحدہ بصورتِ شرح ترمذی چھاپنے کی توفیق ملتی۔ ''معارف'' بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی

توجہ اور سال بہ سال کے جدید اضافوں کی وجہ سے اپنی مستقل حیثیت پا چکی ہے ......۔

حضرت الاستاذ (مولانا محمد انور شاہ کشمیری) رحمہ اللہ کے شاگردوں کا طبقہ بھی اب رخصت ہو رہا ہے، اگر ان کے ہاتھوں سے حضرت شیخ رحمہ اللہ کے خصوصی علوم کی امانت محفوظ نہ ہو سکی تو یہ مختلف گھروں میں درسی یادداشتیں ضائع ہو کر اس طبقے پر ایسا دَین (قرض) باقی رہ جائے گا جسے کوئی دوسرا کبھی ادا نہ کر سکے گا، اس دَین کی ادائیگی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے چند ہی خوش نصیب تلامذہ کو ایسی استعداد دی ہے کہ وہ اسے کما حقہ ادا کر سکیں۔ اگر یہ کام قریبی فرصت میں نہ ادا ہوا تو ایک بڑا سرمایہ ضائع ہو جائے گا۔ آپ اس طبقے کی طرف سے عزمِ نو فرما لیجیے، اور دونوں جہاں کی بھلائیاں اور شکر گزاری اپنے لیے مخصوص کر لیجیے، ان شاء اللہ یہ کام آپ کا صدقۂ جاریہ اور باقیاتِ صالحات ہوگا۔ یہ علمی دَین تو ضرور ہے، لیکن اسے مالی دَین نہ سمجھا جائے، آپ جو کچھ وقت آئندہ صرف فرمائیں گے اس کا حقِ خدمت ان شاء اللہ علیحدہ محسوب ہوگا۔ والأمر بيد الله!

۳- ''مصنف عبد الرزاق'' کی تسوید وتصحیح کے لیے مولانا سید حامد حسن صاحب سلمہ کا انتخاب- يجز يكم الله خيرا- اچھا ہوا، ''لمحات'' کے ملنے کی مسرت ہے، ''لمحات'' و''عبقات'' (از شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ) دونوں کو ساتھ طبع کرانے کی تجویز کے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟ ان کی عربی ٹائپ کی طباعت میں ایڈیٹنگ کی جو کچھ بھی خوبی پیدا ہو سکتی ہو، اس کے لیے مولانا محمد طاسین صاحب سلمہٗ کو مشورہ دیجیے گا۔

۴- هنيئًا لكم! دورۂ مشرقی پاکستان کی علمی سعی اللہ قبول فرمائے، علمی ادارے کے لیے ایسے دورے ضروری ہیں، علمی تازگی اور معیار بلند اور درست کرنے کے لیے ایسے اسفار مفید ہی ہو سکتے ہیں، اللہ کرے ایسے اور بھی مواقع نصیب ہوں، خدمت کے مواقعِ خیر اگر آپ کے علم میں آئے ہوں تو احسان فرما کر عزیزم مولانا محمد طاسین صاحب سلمہٗ کو کچھ نام اور پتے لکھوا دیے جائیں، والله يزيدكم حُسنًا وإحسانًا!

مولانا محمد طاسین صاحب سلمہٗ کے دفتری کاموں کو کم کرنے کا مشورہ صحیح ہے، ان کو خالص علمی کاموں میں لانے کے لیے یہ ضروری ہے، (تاکہ) گاہ بہ گاہ ان کی غیر حاضری میں کوئی (مجلسِ علمی کی) نگرانی کر سکے، ایسے کسی معتمد آدمی کو اب ملا لینے کا وقت آ گیا ہے، اللہ کرے کوئی مناسب آدمی مل جائے۔ اللہ تعالیٰ حکومت کے کاموں کو اپنے فضل سے سدھار دے، آپ کے پہلے کرم نامہ سے اُمید وتوقعات تازہ ہو گئے تھے، اس عنایت نامہ سے افسردگی ہے۔ اللّٰهم لا تسلّط علينا بذنوبنا من لا يخافك ولا يرحمنا!

محترم والد صاحب (مولانا محمد زکریا بنوری) مدظلہٗ اور اہلِ بیت، نیز ارکانِ مدرسہ کے لیے

سلامِ مسنون واشواق! نورِ چشم محمد (بنوری) سلمہٗ کے لیے پیار ودعاء! ایامِ مبارکہ میں دعواتِ صالحہ وتوجہاتِ سامیہ سے احسان فرمائیے گا۔ والسلام واللہ معکم دعا گو ودعا جو

احقر محمد ابن موسیٰ میاں عفا اللہ عنہما

بقلم عبدالرحمٰن ابن ابراہیم میاں عفا عنہ

پس نوشت: ناکارہ عبدالرحمٰن کی جانب سے سلامِ مسنون قبول فرمائیں، اور دعاء کے لیے عاجزانہ درخواست ہے، بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بھی درخواست ہے۔ اولاد میں چھ لڑکے: محمد، عبداللہ، ابراہیم، احمد، اسماعیل، اسحاق، اور ایک لڑکی بنام فاطمہ ہے، اطلاعاً عرض ہے۔ محترم والد صاحب مدظلہٗ اور مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہٗ کو سلامِ مسنون عرض کردیں، اور دعاء کے لیے درخواست بھی! والسلام: عبدالرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الأخ المحترم مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا مؤرخہ ۱۵ر ستمبر سنہ ۶۰ء کا گرامی نامہ ملا تھا، اور انتظار تھا کہ موعودہ مفصل کرم نامہ آجائے تو پوری بات سن سمجھ کر جواب لکھا جائے، اس دوران میں دو لڑکیوں کی اور دو لڑکوں کی شادیاں بھی مقرر ہوئی تھیں، ان سے فراغت پانا تھی۔ سو الحمد للہ تین شادیاں (عائشہ، راشدہ سلمہا، ویوسف اسحاق سلمہم کی) ہوگئیں، اور ان شاء اللہ قاسم سلمہ کی شادی ۱۲ر رجب سنہ ۸۰ھ مطابق یکم جنوری سنہ ۶۱ء کو ہونے والی ہے۔ ان سب کے لیے آپ سے دعاء کی درخواست بھی کرنی تھی، اس لیے جواب میں قدرے تاخیر ہوئی.....۔

ایک بات یہ سمجھ میں آئی تھی کہ پوری ''معارف السنن'' کی بیش قدر قیمت کو محفوظ کرنے کے لیے زیرِ نگرانی کے دس نسخوں کے لیے پانچ ہزار خرچ کردیئے جائیں۔ اب آپ کی طرف سے جن چار جلدوں کی طباعت کی تجویز ہے، اس میں بیس پچیس ہزار کی اور دو تین سالوں کی ضرورت ہوگی، پھر بھی کام نہ صرف ناتمام، بلکہ محض ایک ثلث ''جامع ترمذی'' پر ہوگا، اور ''آثار السنن''، ''فتح الملہم''، ''إعلاء السنن'' اور ''التعلیق الصبیح'' وغیرہ جیسی ایک ناتمام خدمت ہوسکے گی، اس لیے پہلے سے یہ گزارش کرتا رہا ہوں کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مختصر لیکن مکمل خدمت مقدر فرمائے، اور ''الأمالي الکشمیري'' اس سے آدھے وقت میں اور آدھے خرچ میں جلد از جلد آپ کے لیے نامزد ہوکر علمی اثر اور صدقۂ جاریہ بن جائے، اور اسی کا مفصل خاکہ ''معارف السنن'' اس کے بعد شائع ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اصل ارادہ اور منصوبہ بھی ''العرف الجدید'' کا ہی تھا، اب وہ پھیلتے پھیلتے ایسا بے قابو ہوگیا کہ نہ

یہ ہوا، نہ وہ۔ دینی سمجھداری کا تقاضا یہی ہے کہ مختصر کام پہلے کرلیا جائے، اور بڑا کام بعد میں، ورنہ دونوں کے نامکمل رہنے کا سخت خطرہ ہے۔ معکوس ترتیب کی کوئی خاص مصلحت اب تک سمجھ میں نہ آسکی، ورنہ ویسے تو آپ کی جوکوئی علمی خدمت چھپ جائے، سبھی غنیمت ہیں، حتیٰ کہ آپ کے رسالائی (دینی مجلّات میں شائع شدہ) مضامین کو بھی شوق سے سنتا ہوں، اور استفادہ کے لیے شکرگزار رہتا ہوں۔ زمانہ بھی اختصار جُو اور تلخیص پسند ہوگیا ہے، لمبی بحثوں کو علماء اور مدرسین تک نہیں پڑھتے، آپ کا تجربہ بھی ایسا ہی رہا ہوگا۔

یہ خیال بھی آیا تھا کہ کوئی اشاعتی ادارہ ''معارف السنن'' کو اس طرح طبع کرے کہ اصل بالکل محفوظ رہے، اور آپ کے سامنے بالکل قلمی نقل ہوکر طبع ہو، اس نقل سے طباعت ہو اور آپ کا قلم کا مسودہ بالکل محفوظ رہے۔ اور قیمتوں کو فی الجملہ ارزاں رکھا جائے تو اس میں بھی کوئی خاص خرچ نہیں ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ اس زمانے میں اپنا مالی نفع کون چھوڑے گا؟ .... فکر ہے کہ بلند وعدوں پر آپ کو کسی معاہدہ میں کوئی چالاک تاجر جکڑ بند نہ کرلے، جیسے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو .... بیس سال تک -إنا لله- تھکایا، اس لیے (اس) خیال کو چھوڑ دیا، ورنہ ''مجلسِ علمی'' کو الحمدللہ اپنی صرف شدہ رقم کا کوئی ذرا سا بھی خیال نہیں ہے، جو کوئی بھی صورت ہو کام ہوجانے کا پورا خیال رہتا ہے، نام اور دام کا تو بفضلہٖ تعالیٰ کبھی خیال تک بھی نہیں آتا، بدظنی اور بدگوئی تو دور کی باتیں ہیں۔ آپ کسی کی کہی سنی باتوں پر کچھ خیال نہ کریں، مقصد آپ کا اور ''مجلسِ علمی'' کا الحمدللہ ہمیشہ مخلصانہ اور للّٰہی رہا ہے، اب جبکہ آپ نے مسلسل اور بار بار کی گزارشوں کو پذیرائی نہیں بخشی تو کیا اب آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ ''الأمالي الكشميري'' اور ''معارف السنن'' دونوں کاموں کو طباعت کے لیے ساتھ ساتھ چلا سکتے ہیں؟ ایک ہی کام کی دو صورتیں ہوں گی: ایک مختصر، دوسری مطوّل، ایک مُوجز اور ایک مفصل۔

الحمدللہ کہ اس دوران میں مولانا عبدالعزیز صاحب مرحوم اور مولانا عبدالقدیر صاحب سلمہ اللہ کی تحریری یادداشتوں کا سرمایہ ونشانہ بھی مل گیا، جو سب شامل ہوسکے گا۔ علاوہ ازیں ایک بڑی لالچ یہ بھی ہے کہ فقہی ابواب کے علاوہ کی قیمتی باتیں جس میں حدیث فہمی اور مطلب رسی کے بہت سے بیش بہا مضامین ہیں، اور جن کی طرف اور حضرات نے توجہ نہیں کی ہے، اور جن کے درک کے لیے آپ کے پاس خاص استعداد ہے، مثلاً: اعجازِ الفاظِ حدیث کی تشریح، معانی اور بلاغت کی نادر چیزیں، معارف اور حکم کی خاص باتیں آپ کے حصے میں آجائیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ان شاء اللہ مسلمانوں کو عمل پر اُبھاریں گی، ان کے دلوں میں اس غیر متلو وحی (ذخیرۂ حدیث) کی قدر و قیمت جمائیں گی، اور ذخیرۂ حدیث کے ساتھ جو بے انصافی برتی جارہی ہے، اس کا ٹھوس جواب ہوں گی کہ اعجازِ قرآن کی طرح اعجاز وحکمِ حدیثی بھی بہت بہت قدر کی چیز ہے۔ فقہی ابواب پر تو سبھی نے زور لگایا ہے، لیکن اس باقی حصہ پر (علامہ کشمیری

رحمہ اللہ کے) تلامذہ میں سے کسی نے زیادہ کام نہیں کیا ہے، یہ پورا میدان آپ کے ہاتھ آجائے گا۔ اللہ کرے آپ کے خاطرِ عاطر میں یہ بات سما جائے، اور بتوفیقہٖ تعالیٰ آپ کام کا قدم جلد آگے بڑھائیں۔ اگر کام شروع کر دیا تو ضرور اطلاع دیں، بہت سے اہلِ علم کی نگاہیں اور امیدیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں معلوم کرنی ہیں:

①- پہلے یہ اندازہ بتایا گیا تھا کہ پوری ''معارف السنن'' پانچ سو (۵۰۰) صفحہ کی چار جلدوں میں، مجموعہ دو ہزار (۲۰۰۰) صفحات پر آئے گی۔ اب صرف (کتابُ) ''المناسك'' تک اتنی ضخامت ہوجاتی ہے۔ بقیہ کتنا حصہ ہے؟ اور اس کے ابواب اور جلد وار تقسیم کیسی ہوگی؟ اور پوری کتاب کتنی جلدوں میں کتنے صفحات پر آئے گی؟

②- ''الأمالي الكشميري'' (العرف الجديد) کا تخمینہ ضخامت، جلد وار باب وار منصوبہ کیسا ہونا چاہیے؟ دو تین جلدیں ہوجائیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

③- ان دونوں کے لیے وقت، مصارف ومعاوضہ کا کیا اندازہ ہوگا؟ صفائیِ معاملات وعہد پورا کرنے کے لیے ان کی تعیین نہایت ضروری ہے۔

④- ''الإتحاف'' کی مستقل تخریج، تشریح وتہذیب کے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟ اگر کوئی نقشہ ذہن میں ہو تو تحریر فرمائیں۔ مقدمہ ''عقيدة الإسلام'' کے لیے شکرگزار ہوں، اور رؤیا (خواب) کی بشارت ومقبولیت کے لیے مبارک باد عرض ہے، آپ بہت خوش نصیب ہیں۔

برادر مولانا عزیز احمد صاحب سلمہ نے ''خاتم النبيين'' (تالیف علامہ کشمیری رحمہ اللہ بزبانِ فارسی) کا ترجمہ آپ کے پاس مشورہ کے لیے بھیجا ہے، اُمید ودعاء (ہے) کہ پسند آیا ہو اور ضروری مشورہ بھی دیا گیا ہو۔ مولانا عزیز احمد صاحب نے ''ضرب الخاتم'' اور ''مرقاة الطارم'' کو منضم کرنے کے لیے دونوں کتابیں دیکھنے کے لیے منگوائی تھیں، اس سلسلہ میں اگر کوئی مفید مشورہ ہو تو خود یا برادر مولانا محمد طاسین صاحب سلمہ کی معرفت رہنمائی فرمائیں، والله يجز يكم خيرًا!

محترم والد (مولانا محمد زکریا بنوری) صاحب کی خدمت میں سلامِ مسنون عرض ہے، عزیز محمد (بنوری) سلمہ کے لیے پیار ودیدہ بوسی۔ برادرِ محترم حافظ عبدالرحمٰن، نورِ چشم عبداللہ سلمہ، اسماعیل سلمہ اور ابراہیم سلمہ سلامِ مسنون عرض کرتے ہیں۔ والسلام، والله يبارك فيكم

احقر: محمد ابن موسیٰ میاں عفا عنہما
بقلم الفقیر ابراہیم محمد میاں غفرلہ
یوم الإثنین ۲۱ / ۱۲ / ۱۹۶۰ء

گناہوں کی اقسام

اور توبہ کے فضائل وآداب

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ
سابق مُشرف تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

جرم وخطا قابلِ مؤاخذہ

انسان فطری طور پر کمزور واقع ہوا ہے، اس میں بعض ایسی قوتیں (جیسے قوتِ غضبیہ اور قوتِ شہویہ) ودیعت کی گئی ہیں کہ ان پر قابو پانا آسان نہیں، اس لیے اس سے خطا ہوتی رہتی ہے، وہ کبھی جان بوجھ کر جرم کر بیٹھتا ہے، کبھی انجانے میں اس سے گناہ ہوجاتا ہے، بھول چوک سے بھی لغزش ہوجاتی ہے۔ بہر حال خطا وجرم قابلِ مؤاخذہ ہے۔

گناہوں کی اصل

غفلت، نسیان، بھول چوک، گمراہی اور بے راہ روی اس کی جڑ ہیں، شمس الدین ابن قیم الجوزیہ دمشقیؒ متوفی ۷۵۱ھ ''الجواب الکافي'' صفحہ: ۱۳۳ پر رقم طراز ہیں:

''معاصی، شہوت وشبہات کے خلاف جہاد کے لیے حسب ذیل امور کی تکمیل ضروری ہے: ①- دشمن کے مقابلے میں پامردی۔ ②- دشمن کی نگرانی اور سرحدوں کی نگہبانی۔ ③- قلوب اور اس کی سرحدوں کی حفاظت، تاکہ دشمن سرحدوں سے اندر نہ آسکے۔ سرحدیں یہ ہیں: ۱- آنکھ، ۲- کان، ۳- زبان، ۴- پیٹ، ۵- ہاتھ، ۶- پاؤں۔''

یہی راستے ہیں جن سے دشمن اندر داخل ہونے کا راستہ پاتا ہے، لہٰذا ان سرحدوں کی حفاظت کرو، تاکہ دشمن داخل نہ ہوسکے۔ یہ صحابۂ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، جنہوں نے ان سرحدوں کی اچھی

طرح حفاظت کی تھی، ان سرحدوں کی حفاظت ورع وتقویٰ سے کی جاتی ہے، دعاؤں میں کثرت سے اس کا ذکر موجود ہے۔

گناہ ومعصیت کا ظاہری اثر

گناہ ومعصیت کا ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ گنہگار کو مدح وشرف کے بجائے مذمّت کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، چنانچہ اسے مؤمن، صالح، محسن، متقی، مطیع، منیب (اللہ سے رجوع کرنے والا) ولی، عابد، خائف، اَوّاب (اللہ سے لَو لگانے والا) وغیرہ الفاظ کے بجائے فاجر، عاصی، معاند (مخالفِ حق)، مفسد، خائن، زانی، لوطی، سارق (چور) قاتل، کذاب (دروغ گو) رشتہ توڑنے والا اور بے وفا کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، جو اسے قہرِ الٰہی کی وجہ سے دوزخ میں جانے کا مستحق اور ذلت ورسوائی کی زندگی گزارنے والا بنادیتا ہے۔ اس کے برعکس متقی، رحمٰن کی رضا کا اور جنت میں داخلے کا مستحق ہوتا ہے۔

گناہوں کی اقسام

گناہوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے، تاہم محققین علماء نے بڑے بڑے گناہوں کی نشاندہی کی ہے، ان سے احتراز ہر حال میں لازم ہے، چنانچہ علامہ ابن قیم الجوزیہؒ ''الجواب الکافي'' میں رقم طراز ہیں:

''گناہوں کی دو قسمیں ہیں: ①- کبائر (بڑے بڑے گناہ)، ②- صغائر (چھوٹے چھوٹے گناہ)۔ ان معاصی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی فرمانبردار حاکم اپنے غلام وخادم کو کسی مہم پر دور بھیجے اور دوسرے کو حکم دے کہ گھر کا فلاں کام کرنا، پھر وہ دونوں اس کی سرتابی کریں تو ان پر اس کی ناراضگی برابر ہوگی، وہ دونوں ہی اس کی نظر سے گر جائیں گے۔''

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ''استخفاف المعاصی، صفحہ: ۵'' میں فرماتے ہیں:

''ہر گناہ (گو وہ صغیرہ ہو) اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہے، کیونکہ گناہ کی حقیقت ہے حق تعالیٰ شانہ کی نافرمانی، اور نافرمانی خواہ چھوٹی ہو، بڑی ہے، باقی گناہِ صغیرہ اور کبیرہ کا تفاوت ایک امرِ اضافی ہے، ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں، کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیے، جیسے آسمانِ دنیا عرش سے چھوٹا ہے، مگر حقیقت میں کوئی چھوٹی چیز نہیں (ناپاکی ناپاکی ہے، چاہے تھوڑی ہو، مگر حقیقت میں ناپاکی ہے)۔''

موصوف ''تذکیر الآخرۃ'' صفحہ: ۲۵ میں رقم طراز ہیں:

''گناہِ صغیرہ (چنگاری کی طرح ہے) چھوٹا سا گناہ بھی تمام نیکیوں کو برباد کرسکتا ہے، جس طرح

چھوٹی سی چنگاری سارے گھر کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔''

تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گناہوں کے درجات اور ان کی سزائیں مختلف ہیں۔

کبائر کی تعریف

وہ علماء جنہوں نے کبیرہ گناہوں کے عدد کی تعیین وتحدید نہیں کی، ان میں سے بعض علماء کہتے ہیں: قرآن میں جن گناہوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، وہ کبیرہ ہیں اور جن گناہوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا وہ صغیرہ ہیں۔

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ: جن گناہوں کی ممانعت یا جن پر لعنت وغضب کی وعید یا سزا آئی ہے وہ کبیرہ ہیں، ورنہ صغیرہ ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے: دنیا میں جن پر حد قائم ہو یا آخرت میں وعید آئی ہو وہ کبیرہ ہیں اور جن کے متعلق نہ وعید آئی اور نہ حد قائم ہوئی وہ صغیرہ ہیں۔

بعض کا مختار یہ ہے کہ: جن گناہوں کے حرام ہونے پر شرائع متفق ہیں وہ کبائر ہیں، جنہیں کسی شریعت نے حرام قرار نہیں دیا وہ صغائر ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے: جس گناہ کے کرنے والوں پر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی، وہ کبیرہ ہیں۔

جن علماء نے گناہوں کی تقسیم کبائر وصغائر میں نہیں کی، وہ کہتے ہیں: تمام گناہ جن میں سرتابی وجرأت پائی گئی اور حکمِ الٰہی کی مخالفت پائی گئی وہ کبائر میں داخل ہیں۔ جس نے ''امر اللہ''، حکمِ الٰہی سے سرتابی کی، محارم و حدود اللہ کو توڑا، وہ تمام گناہ کبیرہ ہیں، اور فساد میں برابر ہیں۔

کبائر کی تعداد

کبائر کی تعداد میں اختلاف ہے: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چار بتاتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سات فرماتے ہیں۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نو بیان کرتے ہیں، بعض علماء گیارہ اور بعض سترہ کے قائل ہیں۔

گناہوں کی اقسامِ اربعہ

گناہ (ذنوب) چار قسم کے ہیں:

①- ذنوبِ ملکیہ۔ ②- ذنوبِ شیطانیہ۔ ③- ذنوبِ سبعیہ۔ ④- ذنوبِ بہیمیہ

①- **ذنوبِ ملکیہ:** صفاتِ ربوبیہ کا انجام دینا، جیسے عظمت، کبریائی، جبروت، قہر، علو کا اظہار کرنا

اور خلقِ خدا کو بندہ بنانا۔

۲-ذنوبِ شیطانیہ: حسد، سرکشی، دغابازی، کینہ پروری، مکر و فریب اور معاصی پر اکسانا اور اطاعتِ الٰہی وفرمانبرداریِ خداوندی سے روکنا، اس کو کمتر سمجھنا، بدعت کی طرف لوگوں کو بلانا، اگرچہ اس کی خرابی پہلے سے کمتر ہے۔

۳-ذنوبِ سبعیہ: عُدوان، سرکشی، غضب، خون بہانا، کمزوروں کو دبانا، ظلم وسرکشی پر جرأت کرنا۔

۴-ذنوبِ بہیمیہ: پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات پوری کرنا جس سے زنا کا ارتکاب ہوتا ہے، چوری کرنا، یتیموں اور ناداروں کا مال کھانا، بخل وحرص، بزدلی، مصیبت کے وقت صبر نہ کرنا، وغیرہ ہیں۔

مُکفِّرات کے درجاتِ ثلاثہ

مُکفِّرات (گناہوں کو مٹانے والے اعمال) کے تین درجے ہیں:

❶-بعض وہ اعمال ہیں جو اپنی کمزوری وناتوانی کی وجہ سے چھوٹے گناہوں کو بھی مٹانے کے لائق نہیں، چنانچہ بعض نیک اعمال، اخلاص اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی بنا پر ضعیف دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو کمیت وکیفیت کے اعتبار سے بہت کم اثر کرتی ہے۔

❷-بعض وہ اعمال ہیں جو صغائر کے لیے کفارہ ہوجاتے ہیں، چھوٹے گناہ ان کی وجہ سے معاف ہوجاتے ہیں، لیکن وہ کبائر میں سے کسی گناہ کو نہیں مٹاتے۔

❸-وہ اعمال ہیں جو ایسی طاقت رکھتے ہیں کہ صغائر کو مٹاتے ہی ہیں، بعض کبائر کو بھی مٹادیتے ہیں۔

اسماعیل حقی بروسیؒ متوفی ۱۱۳۷ھ نے ''روح البیان في تفسیر القرآن، ج:۲،ص:۲۸۶'' میں آیۂ شریفہ: ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی، الخ'' کی تفسیر میں گناہوں کی تین قسمیں ذکر کی ہیں، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

ترجمہ: ''تم جان لو کہ گناہوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ گناہ ہے جو بیک وقت اللہ اور بندے دونوں کے حق سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً زنا، لواطت اور غیبت و بہتان ہیں۔ آخری دو گناہ غیبت و بہتان کا تعلق آپ کے ساتھ اس وقت تک ہے جب تک ان گناہوں سے اسے خبر نہ لگے جس کی بدگوئی کی گئی ہے اور جس پر بہتان تراشی کی گئی ہے اور جب اسے خبر ہوگئی اور اس نے معاف کردیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ بھی معاف فرمادیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کی بیوی سے زنا کیا، جب تک شوہر معاف نہ کرے معاف نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ حق عورت پر شوہر کے منجملہ حقوق میں سے ایک حق ہے، لہٰذا شوہر سے معاف

کرانے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد ہی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ شوہر سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس فعل کو بعینہٖ ذکر نہ کرے، بلکہ یوں کہے کہ: تمہارا میرے ذمہ جو حق ہے، اس کو معاف کردے، لہٰذا شوہر کا یہ کہنا کہ میں اپنے تمام حقوق سے جو تمہارے ذمہ ہیں معاف کرتا ہوں، کافی ہوگا، لہٰذا یہ معلوم شے کی صلح مجہول شے پر ہوئی۔ یہ امتِ محمدیہ کے لیے کرامۃً جائز ہے، ورنہ پچھلی تمام امتوں میں یہ ضروری تھا کہ گناہ معاف کراتے وقت اس گناہ کا ذکر کیا جائے جسے معاف کرانا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کی معافی ہوتی تھی۔

دوسرا: وہ گناہ ہے جس کا بندہ سے تعلق اس حیثیت سے ہے کہ وہ اعمال اللہ تعالیٰ نے بندے پر فرض کیے ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ اور حج ہے، کسی نے انہیں چھوڑ رکھا ہے، لہٰذا محض توبہ کرنا کافی نہیں ہے جب تک ان کی قضا نہ کی جائے، اس لیے کہ یہ گناہ ایسا گناہ ہے جس کی توبہ کی شرط یہ ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے عملوں کی قضا کرے، ورنہ توبہ بے اثر رہے گی۔

تیسرا: وہ گناہ ہے کہ جس کا تعلق گناہ کرنے والے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ہے، مثلاً کسی کا مال چھین لیا، غصب کرلیا، یا کسی کی ناحق پٹائی کی، یا کسی کو گالی دی، یا ناحق کسی کو مار ڈالا، لہٰذا صرف توبہ کرنا کافی نہیں، جب تک کہ جس کا مال لیا یا گالی دی وہ یا اولیاءِ مقتول معاف نہ کریں، یا پھر اعمالِ صالحہ میں اتنی کوشش کی جائے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان دونوں کی آپس میں صلح کرائیں، چنانچہ بندہ جب توبہ کرے اور اس کے ذمہ لوگوں کے حقوق بھی ہوں تو اسے چاہیے کہ ان کے حقوق ادا کرے، اگر لوگوں کے حقوق ادا کرنے سے عاجز آجائے اور قاصر ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی مغفرت فرمائیں گے، چنانچہ قیامت کے دن اس خصم کو حکم دیں گے کہ اپنا سر اٹھاؤ، جونہی وہ سر اٹھائے گا بڑے بڑے محل اس کی نگاہ کے سامنے ہوں گے، جنہیں دیکھ کر یہ پوچھے گا: اے اللہ! یہ کس کے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم بھی اُنہیں لے سکتے ہو، ان کی قیمت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کو معاف کردو، تو وہ کہے گا: اے اللہ! میں نے معاف کیا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑو اور جنت میں چلے جاؤ۔'' (روح البیان فی تفسیر القرآن، ج:۲، ص:۲۸۶)

توبہ اور اس کی شرائط

ہر مؤمن مکلف پر گناہ سے توبہ کرنا فرض ولازم ہے اور اس میں تین باتیں ضروری ہیں:

❶- گناہ پر ندامت وشرمساری اس حیثیت سے نہیں کہ اس کو بدنی یا مالی نقصان ہوا ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی ہے۔

❷ - بلا تاخیر اور سُستی کے پہلی ممکنہ فرصت میں گناہ کو چھوڑنا۔

❸ - کبھی بھی اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عزم اور ارادہ رکھنا اور اللہ نہ کرے پھر وہ گناہ ہو جائے تو از سرِ نو اس عزم و ارادہ کی تجدید کرنا۔

توبہ کے آداب

❶ - نہایت عاجزی و انکساری سے گناہ کا اعتراف و اقرار کرنا۔ ❷ - اس پر استغفار کرنا، اس غلطی و گناہ پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں نہایت عاجزی و تضرع سے معافی مانگنا۔ ❸ - کثرت سے نیکیاں کر کے پچھلی بُرائیوں کو مِٹانا۔

توبہ کے مراتب

① - کفّار کا کفر سے توبہ کرنا۔ ② - نیکی و برائی کرنے والوں کا کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا۔ ③ - سچّے اور نیک لوگوں کا صغائر (چھوٹے گناہوں) سے توبہ کرنا۔ ④ - عبادت گزاروں کا کاہلی، کمزوری اور کوتاہی سے توبہ کرنا۔ ⑤ - سالک و رَہروانِ طریقت کا دلوں کے روگ اور کھوٹ سے توبہ کرنا۔ ⑥ - پارساؤں کا شبہات سے توبہ کرنا۔ ⑦ - اربابِ مشاہدہ کا غفلتوں سے توبہ کرنا۔

اسبابِ توبہ

❶ - عذاب کا خوف، ❷ - ثواب کی امید، ❸ - حساب کے دن کی ندامت و شرمساری، ❹ - حبیب کی محبت، ❺ - ذاتِ باری تعالیٰ کا مراقبہ، ❻ - بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے کا خیال، ❼ - انعامِ الٰہی کا شکر۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گناہوں کو معاف کرانے کا ذریعہ توبہ ہے، اور توبہ وہی قبول کی جاتی ہے، جس میں آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہوتا ہے، قرآن حکیم کہتا ہے:

’’اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا‘‘ (سورۃ النساء: ۱۸-۱۷)

ترجمہ: ’’اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لے لی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے کوئی برائی کر ڈالتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، چنانچہ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اور اللہ ہر

بات کوخوب جاننے والا بھی ہے،حکمت والا بھی ،توبہ کی قبولیت ان کے لیےنہیں جو بڑے گناہ کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آ کھڑا ہوتا ہےتو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کرلی ہے، اور نہ ان کے لیے ہے جوکفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں، ایسےلوگوں کے لیےتو ہم نے دُکھ دینے والا عذاب تیارکر رکھا ہے۔‘‘

معلوم ہوا جو سچّے دل سےتوبہ کرتا اور آئندہ ہمیشہ اصلاح کی غرض سے کبھی گناہ نہ کرنے کا پختہ وعدہ کر کےتوبہ کرتا ہے،اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے،اپنی غلطی پر ندامت ہوتوتوبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے:

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کی اُمید پر گناہ کرتے رہنا درست نہیں، ایسی توبہ مقبول ہی نہیں، انسان جب تک زندہ رہے اپنے گزشتہ گناہوں پر اسے ندامت وپشیمانی ہوتی رہے اور وہ تلافیِ مافات کے لیے بڑھ چڑھ کر نیک کام کرتا رہے۔ یہ بھی اس عالم میں ایک روحانی سزا ہے، اس سزا کے بغیر اس کا عدل قائم نہیں رہتا۔ ذرا غور فرمائیں! ساری عمر جسے اپنے بُرے کاموں کا رنج اور صدمہ رہے وہ بار بارتوبہ کرتا رہے، کیا یہ سزا کم ہے؟ جب توبہ میں دوامی اصلاح کا عہد شامل ہےتو اعمال محدود نہ رہے، اس لیے کہ دوامی عہد کے معنی یہ ہیں کہ اگر تائب کو غیر محدود زندگی مل جائے تو بھی وہ اس عہد پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ قدرت کی طرف سے انسان کی فطرت میں ضعف ونسیان اس لیے ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مالک وخالق کے حضور میں توبہ کرتا رہے اور سربسجود ہوکر اس کی عبودیت کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگتا رہے۔

امام ابن تیمیہؒ کے نامور شاگرد علامہ ابن قیم الجوزیہؒ (۷۵۱ھ) الجواب الکافی، ص:۱۲۱ میں رقم طراز ہیں:

ترجمہ: ’’توبہ ایسی چیز ہے کہ توبہ کرنے کے بعد بندہ گناہ کرنے سے پہلے سے بھی بہتر حالت میں آجاتا اور اس کا درجہ پہلے سے بھی بلندتر ہوجاتا ہے، حالانکہ خطا وگناہ نے اس کی ہمت پست کردی تھی، اس کا ارادہ کمزور اور اس کا قلب بیمار ہوگیا تھا۔ اگر توبہ نے اسے پہلی صحت کی طرف نہیں لوٹایا اور وہ اس درجہ کونہیں پا سکا تو معلوم ہوتا ہے اس نے سچے دل سے توبہ نہیں کی۔ کبھی توبہ سے اخلاقی بیماری جاتی رہتی ہے، سابقہ صحتِ ایمانی لوٹ آتی ہے، وہ اچھے اعمال کرتا رہتا ہےتو بلند درجہ پالیتا ہے، جب میلان معصیت کی طرف بڑھ جائےتو وہ معصیت اصل ایمان پر اثر انداز ہوجاتی ہے، اور آدمی شک وشبہات اور نفاق کے دلدل میں پھنس جاتا ہے، یہ گناہوں کی طرف ایسا

میلان ہے کہ جب تک وہ توبہ سے اپنے ایمان کی تجدید نہیں کرتا اس دلدل سے نہیں نکلتا۔''

مغفرت ومعافی کا نظام

ایک مسلمان سے گناہ ہوجاتے ہیں، لیکن خوفِ خدا اور آخرت کی باز پرس اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ اپنے کیے پر برابر پچھتاتا، پشیمان ہوتا، بارگاہِ الٰہی میں روتا، گڑگڑاتا، سچے دل سے معافی مانگتا، توبہ کرتا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرما کر جہنم کی سزا بھی معاف کردیتا ہے۔

مغفرت ومعافی کے دس اسباب ہیں، جن کی نشاندہی علامہ ابن تیمیہؒ نے ''منہاج السُّنّۃ'' میں کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مطلق گناہ ہر مومن کے لیے جہنم کے عذاب کا باعث ہے، آخرت میں یہ عذاب حسبِ ذیل دس اسباب کی وجہ سے ختم کردیا جاتا ہے:

پہلا سبب

توبہ ہے، گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے جیسا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔ کفر، فسق، فجور، نافرمانی اور عصیان سب سے توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

''أَفَلَا يَتُوْبُوْنَ إِلَى اللهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' (المائدۃ:۷۴)

ترجمہ: ''کیا پھر بھی یہ لوگ معافی کے لیے اللہ کی طرف رُجوع نہیں کریں گے؟ اور اس سے مغفرت نہیں مانگیں گے؟ حالانکہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

توبہ سے گناہ معاف ہی نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کے یہاں مرتبہ بھی بلند ہوتا ہے، جب وہ کسی کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے تو ایسی توبہ کرتا ہے کہ وہ توبہ اسے بعض اوقات منتہائے کمال کو پہنچادیتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ توبہ کو پسند فرماتا ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ'' (البقرۃ:۲۲۲)

ترجمہ: ''بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں، اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔''

توبہ سے برائیاں اچھائیوں میں بدل دی جاتی ہیں۔ گناہ کے بعد بندہ توبہ کرتا ہے اسے شرمساری ہوتی ہے، وہ بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑاتا، روتا دھوتا ہے۔ اس ندامت وفروتنی سے اسے وہ حاصل ہوتا ہے جو اسے پہلے حاصل نہ تھا۔ توبہ اللہ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ نہ ہوتی تو وہ اکرمِ خلق کو آزمائش وابتلاء میں نہ

ڈالتا، ایک حدیث میں آتا ہے: ’’میرا ذکر کرنے والے میرے ہمنشیں ہیں، میرا شکر کرنے والے میری طرف سے زیادہ نعمت کے مستحق ہیں، میرے اطاعت شعار بندے میری عنایت وکرم کے مستحق ہیں، لیکن میں اہلِ معصیت اور گنہگاروں کو اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا، اگر وہ توبہ کریں تو میں ان کا حبیب ہوں، اور وہ توبہ نہ کریں تو میں ان کا طبیب ہوں، انہیں مصائب میں ڈالتا ہوں، تاکہ انہیں برائیوں اور خرابیوں سے پاک وصاف کروں، توبہ کرنے والا اللہ کا دوست ہے، خواہ جوان ہو یا بوڑھا۔‘‘

دوسرا سبب

استغفار کرنا ہے۔ استغفار کے معنی مغفرت وبخشش مانگنا، معافی مانگنا ہیں۔ استغفار، دعا اور سوال کی جنس سے ہے، اور اکثر وبیشتر توبہ کے ساتھ آتا ہے، استغفار کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے، لیکن انسان کبھی توبہ کرتا ہے اور دعا نہیں مانگتا اور کبھی دعا مانگتا ہے توبہ نہیں کرتا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ رب العزت سے نقل کرتے ہیں، یعنی حدیثِ قدسی ہے:

’’کسی بندے نے کوئی گناہ کیا اور شرمسار ہو کر کہا: اے میرے رب! مجھ سے گناہ ہو گیا تو مجھے بخش دے، پھر اس کے رب نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا: کیا میرے بندے کو علم ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اسے گناہ پر پکڑتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو معاف کیا، پھر وہ گناہ سے باز رہا جب تک اللہ نے چاہا، پھر گناہ کر بیٹھا، اس نے پھر کہا: اے میرے رب! مجھ سے دوسرا گناہ ہو گیا تو مجھے معاف فرما، اللہ نے پھر پوچھا کہ میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اسے گناہ پر پکڑتا ہے؟ میں نے اس کی وجہ سے اپنے بندے کو بخش دیا، پھر وہ گناہ سے باز رہا جب تک اللہ کو منظور ہوا، پھر اس سے گناہ سرزد ہو گیا، پھر اس نے عرض کی: میرے رب مجھ سے پھر گناہ ہو گیا تو مجھ سے درگزر کر، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ سے درگزر کرتا ہے اور اسے گناہ پر پکڑتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، پس اسے چاہیے جو چاہے کرے۔‘‘

توبہ تمام برائیوں اور گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور توبہ کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

’’إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا‘‘ (سورۃ النساء:۱۱۶)

ترجمہ: ’’بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اور اس سے کمتر ہر گناہ کی جس کے لیے چاہتا ہے بخشش کرتا ہے، اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، وہ راہِ راست سے بھٹک کر بہت دُور جا گرتا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ توبہ کے متعلق فرماتا ہے:

’’قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ‘‘ (الزمر: ۵۳)

ترجمہ: ’’کہہ دو کہ: ’’اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر رکھی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، یقین جانو! اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔‘‘

نوٹ: استغفار توبہ کے بغیر مغفرت کو لازم نہیں کرتا، لیکن وہ معافی و بخشش کا ایک سبب ضرور ہے۔

تیسرا سبب

اعمالِ صالحہ (یعنی نیک اور اچھے کام) ہیں، چنانچہ قرآن کہتا ہے:

’’إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ‘‘ (سورۃ ہود: ۱۱۴)

ترجمہ: ’’یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ایک نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت مانیں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

’’اے معاذ! اللہ سے ڈرتے رہو جہاں کہیں بھی ہو، بُرائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرو، نیکی بُرائی کو ختم کر دیتی ہے، اور لوگوں سے حسنِ اخلاق سے پیش آؤ۔‘‘

ایک اور موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

’’تم نے دیکھا؟ تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر بہتی ہو اور اس میں وہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہؓ نے جواب دیا: نہیں، فرمایا: اسی طرح پانچ وقت کی نمازیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں جس طرح پانی میل کو مٹا دیتا ہے۔‘‘

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ ہر نیکی اور حسنہ ہر بُرائی اور سیئہ کو نہیں مٹاتی، بلکہ مقابلۃً کبھی وہ صغائر کو مٹاتی ہے اور کبھی کبائر کو مٹاتی ہے، گویا اخلاص کے اعتبار سے یہ فرقِ مراتب ملحوظ رکھا گیا ہے۔

چوتھا سبب

مؤمنین کے لیے دعا کرنا ہے، مسلمانوں کی جنازہ کی نماز پڑھنا، اور اس میں مردہ وزندہ ہر ایک کے لیے مغفرت وبخشش کی دعا مانگنا، اسی طرح نمازِ جنازہ کے علاوہ بھی مؤمنین کا مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کرنا بخشش کا باعث ہے، چنانچہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مسلمانوں کے حق میں برابر مغفرت کی دعا مانگنا احادیث سے ثابت ہے۔

پانچواں سبب

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا امتِ محمدیہ کی مغفرت کی دعا فرمانا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ان کے حق میں استغفار کیا ہے۔ اور وفات کے بعد قیامت کے دن مؤمنین کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے سرفراز ہونا ہے، ان میں وہ مخصوص لوگ بھی شامل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت سے زندگی اور موت سے سرفراز ہوتے ہیں۔

چھٹا سبب

وہ نیک عمل ہے جو مرنے کے بعد مردہ کو تحفہ وہدیہ کے طور پر پہنچتا ہے، جیسے کسی کا کسی کی طرف سے صدقہ کرنا، حج کرنا، روزہ رکھنا، اس کا اجروثواب مردہ کو پہنچتا ہے، اور اس سے اُسے فائدہ ہوتا ہے۔

ساتواں سبب

دنیوی مصائب ہیں: اللہ تعالیٰ دنیوی مصائب سے بھی گناہوں کا کفارہ کردیتے ہیں، جیسا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کو جو مصیبت وتکلیف، رنج وغم اور اذیت پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خطائیں اور گناہ معاف کردیتا ہے۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات آئی ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خاص مصائب اور آزمائشوں سے گزرے ہیں اور عام مصائب سے بھی، چنانچہ فتن میں بہت سے قتل کیے گئے، اور جو زندہ رہے انہوں نے اپنے اہل وعیال، عزیز واقارب کو بھی قتل ہوتے دیکھا، اور وہ اپنے مال میں آزمائش سے گزرے، خود بھی زخم خوردہ رہے، حکمرانی اور عزت وغیرہ سے محروم کیے گئے، یہ تمام ایسے امور ہیں جو مسلمانوں کی سیئات کو مٹادیتے ہیں، پھر صحابہؓ کیوں اس سے محروم رہتے؟

آٹھواں سبب

مؤمن کا اپنی قبر میں جھٹکے اور فرشتوں کے سوالات سے (جو امتحان وآزمائش ہے) گزرنا بھی گناہوں

کو مٹا دیتا ہے اور مغفرت کا سبب بنتا ہے۔

نواں سبب

آخرت میں قیامت کے دن کی ہولنا کی، بے چینی اور تکلیف کو برداشت کرنا ہے۔

دسواں سبب

مؤمنین کا پُل صراط سے گزرنا، جنت و دوزخ کے پل پر ٹھہرنا، اور جہنم کے مناظر کو دیکھنا، اور اس سے تہذیب و تربیت پا کر جنت میں داخلہ کی اجازت و بشارت سے سرفراز ہونا ہے۔

نوٹ: مذکورہ بالا اسبابِ عشرہ ان صورتوں میں ہیں جب گناہ محقق و ثابت ہوں۔

ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں سبب میں جو مختلف تکالیف پر گناہوں کی معافی کا ذکر ہے، ان کا مقصد تطہیر ہے، ایک مسلمان کو اس کے گناہوں سے اس طرح پاک صاف کرنا ہے جس طرح دھوبی کپڑے کو میل کچیل سے پاک صاف کرتا اور داغ دھبے مٹا کر اسے قابلِ استعمال بناتا ہے۔ یہ سزا ایک مسلمان کو جنت میں داخل کرنے، اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور ہمیشہ آرام و راحت سے زندگی بسر کرنے کا اہل و مستحق بنانے کے لیے دی جاتی ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

ایصالِ ثواب کی درخواست

جامعہ کے سابق ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبدالقیوم چترالی رحمہ اللہ کی اہلیہ محترمہ اور جامعہ کے استاذ حضرت مولانا عبداللہ چترالی صاحب کی والدہ ماجدہ ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۳/نومبر ۲۰۲۳ء ہفتہ کی شب میں انتقال فرما گئیں۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطی وکل شيء عندہٗ بأجل مسمّٰی. اللّٰھم اغفر لھا وارحمھا وعافھا واعف عنھا وأکرم نزلھا ووسع مدخلھا . آمین.

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور حضرت مولانا عبداللہ چترالی صاحب اور دیگر پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین بینات سے اُن کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مخالفت کیوں؟!
واقعاتی تناظر میں چند اسباب

افادات: علامہ ڈاکٹر خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ
پی ایچ ڈی، لندن

جب حرص و ہوا اور فانی لذتوں کے انہماک نے دنیا کی اخلاقی حالت بالکل تباہ کر رکھی تھی، آسمانی کتابوں کے چہرے مسخ کیے جا چکے تھے، جتنے چراغ تھے سب گل ہو چکے تھے اور آفتاب عالمتاب کا انتظار تھا، سرزمینِ عرب میں فاران کی چوٹیوں سے ایک عالمگیر تحریک اُٹھی اور خدا کی آخری ہدایت کا نزول ارضِ حجاز میں ہوا، یہیں سے ابدی صداقت اور لافانی رحمت کے چشمے پھوٹے، بیرونی اقوام اور دشمنانِ اسلام ابتدا میں اس کی ترقی کا اندازہ نہ کر سکے اور وہ ہمسایہ سلطنتیں جو اپنے اپنے خیال میں ایک ناقابلِ زوال مرکزی طاقت تھیں، اس انتظار میں تھیں کہ شاید خود عرب ہی اس انقلابی تحریک کا جواب ہو جائیں، انہیں اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ ایک ایسا وقت آئے گا جب انہی بے سروسامان عربوں کا جھنڈا ان عجمی ممالک پر بھی آلہرائے گا۔

مکہ والے ابھی اپنے اقتدار کے نشہ میں ہی مخمور تھے کہ دیکھتے دیکھتے مکہ فتح ہو گیا اور پھر سارے جزیرۂ عرب پر اسلام کا قبضہ ہو گیا، اسلام کی یہ ترقی قیصرِ روم اور کسرائے ایران کی نگاہوں میں بہت تشویشناک تھی، مگر ایک موہوم اُمید انہیں سہارا دے رہی تھی کہ چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد نہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر دنیا ایک نیا رخ بدلے گی اور آندھی کی طرح اُٹھنے والی قوم ایک بگولے کی طرح اُڑ جائے گی، یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ جانشینانِ رسالت حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ رحمت کو نہ صرف دنیا کے کونے کونے تک پہنچائیں گے، بلکہ عربوں کی اس سیادت اور قیادت کے آگے دنیا کی سب طاقتوں کو سرنگوں ہونا پڑے گا، ان عجمی حریفوں اور ہمسایہ سلطنتوں کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں، جب انہوں نے دیکھا کہ اس مرکزِ رحمت اور پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے ساتھ پوری وفا کی اور جذباتِ غمِ جدائی میں کھونے کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کرنے سے پہلے

پہلے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ یہ تحریک کس نظامِ ملی کے ساتھ جاری رہے گی، وہ دشمن جو گھات لگا کر وقت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے، انہیں سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ اصحابِ رسول ﷺ نے آپ کے دفن سے پہلے پہلے نظامِ خلافت کے سربراہ کا انتخاب کیوں کرلیا ہے؟ کیوں نہ مسلمانوں کو کچھ وقت کے لیے لاوارث چھوڑ دیا گیا، تاکہ دشمنانِ اسلام اپنے خوابوں کی کوئی تعبیر دیکھ سکتے۔ رب العزت کی کروڑوں رحمتیں ان نفوسِ قدسیہ پر جنہوں نے غم و ماتم کا شکار ہونے کے بجائے زندہ قوموں کی طرح اپنی زندگی باقی رکھی۔

سلطنتِ اسلام کے اس تحفظ سے اہلِ اسلام کے قدم کچھ آگے بڑھے اور جب سلطنتِ ایران اور دولتِ یونان ضربِ فاروقی کے ایک ہی صدمہ سے پاش پاش ہوگئیں تو پھر ان ناکام تمناؤں نے انداز بدل کر کلمۂ اسلام کا اقرار کیا اور پھر مارِ آستیں بن کر تحریکِ اسلام کی بیخ کنی پر اُترے، اسلام کی ترقی اور ملت کی مرکزیت چونکہ نظامِ خلافت سے وابستہ تھی اور گلہ بان کی موجودگی میں کوئی بھیڑیا تحریکِ اسلام کے اس ریوڑ پر حملہ آور نہ ہوسکتا تھا، اس لیے ان دشمنانِ اسلام کا پروگرام یہی بنا کہ خلافت کو بدنام کیا جائے، اب ان کی تحریک' رسالت کے اقرار اور خلافت کی مخالفت کے عنوان سے چلنے لگی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا پہلا سبب یہ تھا کہ عربوں کو ایران و عجم پر تفوق کیوں مل رہا ہے؟ اور عالمی قیادت اور سیادت عربوں کے حصے میں کیوں آرہی ہے؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی میں اگر واقعی کوئی کمزوری ہوتی تو ان کے خلاف عرب سے ہی کوئی آواز کیوں نہ اُٹھتی؟ پس جبکہ یہ مخالفانہ ہوائیں ان حریف ملکوں سے چلیں تو یہ بات ایک امر یقینی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ مخالفت عربوں کے خلاف محض ایک سیاسی رقابت کا نتیجہ تھی۔ آپ ﷺ نہایت واضح الفاظ میں اسلام کے قیصر و کسریٰ پر غالب آنے کی پیشگوئی فرما چکے تھے، جنگِ خندق کے دن آپ ﷺ نے خندق کھودتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اس ضرب میں کسریٰ اور قیصر کے خزانے مجھ پر فتح ہوتے دکھائے گئے۔'' پھر فتحِ ایران نے جانشینانِ رسالت مآب ﷺ کے قدم چومے اور آپ ﷺ کی وہ پیش گوئیاں ایک شانِ اعجاز کے ساتھ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پوری ہوئیں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت اور سیادت اگر کسی درجہ میں بھی مشتبہ ہوتی تو آپ ﷺ اس عہد میں ہونے والے ان کارناموں کو اپنی طرف نسبت نہ فرماتے۔

ایران فتح ہوگیا، لیکن فتوحاتِ فاروقی کی تیز رفتاری کے باعث ان نئے مفتوحہ علاقوں کی ذہنی تربیت کی طرف پوری توجہ نہ دی جاسکی، عوام اسلام کی اس عالمی تحریک کو عربی عجمی کشمکش کی مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے، یہ احساسِ شدید ان کے دلوں کو بری طرح زخمی کر رہا تھا کہ عربوں کو ایرانیوں پر یہ سیاسی تفوّق

کیوں حاصل ہورہا ہے؟! دشمنانِ اسلام نے ایرانیوں کے اس نفسیاتی تقاضے کا پوری طرح فائدہ اُٹھایا اور کلمہ گویانِ اسلام کے ایک پورے طبقے کے سامنے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ایک غاصب، جابر اور غیر ملکی حکمران قرار دیا، یہ لوگ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر غصبِ خلافت کا الزام لگاتے تھے، لیکن اس اندیشے سے کہ کہیں ان کا اقرارِ کلمہ ہی بے اعتبار نہ ہو جائے، جبر وغصب کے مظلوم شاہانِ عجم کو قرار دینے کی بجائے بنو ہاشم کی مظلومیت اور ان کے استحقاقِ خلافت کے دعوی کا غلط پروپیگنڈا کیا، لیکن جب بھی ان لوگوں کو موقع ملتا اندر کی بات اُگل دیتے، قومی افتخار کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے تاریخ میں جھوٹ ملانا ایرانیوں کے نزدیک ایک قومی خدمت ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے اسباب میں ہمارے نزدیک پہلا اور بنیادی سبب وہی ہے جو ایک غیر جانبدار تنقیدی نگاہ کا فیصلہ ہے، یہ فاضل روزگار ایڈورڈ براؤن کی رائے ہے، وہ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں سے دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو اہلِ عجم متنفر ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غارت گرِ عجم تھے، اگرچہ اس نفرت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا، لیکن اصل حقیقت اندر سے صاف نظر آتی ہے۔

پھر اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو عداوت ہے، اس کا سبب یہ نہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حقوق کو غصب کیا، بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے ایران کو فتح کر کے ساسانی خاندان کا خاتمہ کیا۔ ایرانیوں کی یہ غیر معمولی عصبیت جس نے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر لی اور آخر کار اس سیاسی اور نظریاتی شکست کا سامانِ تسکین فاتح ایران کی تنقیص وتوہین قرار دیا گیا، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھی، چنانچہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بنفسِ نفیس جنگ فارس میں قیادت کا ارادہ فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے شانِ مرکزیت کے خلاف سمجھتے ہوئے آپ کو جانے سے روکا، اس وقت آپ نے یہ بھی عرض کی تھی کہ بیشک جب ایرانی آپ کو دیکھیں گے تو کہیں گے: یہی عربوں کی جڑ ہے، پس اگر اس جڑ کو کاٹ ڈالو تو ہمیشہ کا آرام پاؤ گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی نظرِ بصیرت سے جنگِ فارس کے نتائج میں عربی عجمی کشمکش کا انداز بھانپ رہے تھے۔

حاصلِ کلام یہ کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا پہلا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ فاتحِ ممالکِ عجم تھے اور ایرانی اقوام اس بات کو برداشت نہ کرسکتی تھیں کہ عربوں کو ان پر کوئی سیاسی تفوّق حاصل ہو، یہ وہ جذبہ تھا جو مرکزِ ملت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دبی مخالفت کی صورت میں جلوہ گر ہوا، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فتح ایران سے پہلے ایران میں ساسانی خاندان کی حکومت تھی، ساسانیوں کا طرزِ حکومت عربوں کے طرزِ حکومت سے بنیادی طور پر مختلف تھا، ساسانی بادشاہ اپنے آپ کو دیوتا یا ربانی وجود کہتے تھے اور صرف آلِ ساسان کو ہی عجمی تاج پہننے کا حق حاصل تھا اور کسی خاندان کے کسی فرد کا اس منصب پر فائز ہونا نہ صرف بالائے فہم، بلکہ بالائے وہم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بالمقابل عرب جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی کسی کی قیادت قبول نہ کی تھی، کسی ایسے نظامِ حکومت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جو نسلی امتیازات پر مبنی ہو، بلکہ وہ فطرتاً جمہوریت پسند تھے، ہر قبیلے کا اپنا اپنا سردار ہوتا تھا اور اسے کسی قسم کی نسلی مرکزیت کے ماتحت نہ سمجھا جاتا تھا، جب وہ لوگ دولتِ اسلام سے بہرہ مند ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باقاعدہ نظامِ حکومت کے قیام کے باوجود عربوں کی اس فطری جمہوریت پسندی کو قائم رکھا، اللہ جل جلالہٗ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (باوجود یہ کہ آپ نبی تھے، مگر آئندہ کے لیے ایک اصول قائم کر دینے کے پیشِ نظر) خالص دنیوی معاملات میں شوریٰ قائم کرنے کا حکم دیا، قرآن پاک میں ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ '' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ دین مکمل اور شریعت محفوظ تھی، اس لیے کسی قسم کے آسمانی منصب کی ضرورت باقی نہ رہی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امیر کا انتخاب بھی شوریٰ پر مبنی قرار پایا، سلسلۂ نبوت کے ختم ہوجانے کے باعث یہ منصب ایک خالص ارضی منصب رہ گیا تھا، امیر کی ضرورت صرف اس لیے تھی کہ وہ سلطنتِ اسلامیہ کا انتظام کرے اور اللہ تعالیٰ کی حدیں قائم ہوں۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت بھی بشمولیت حضرت علی رضی اللہ عنہ جمہوریت اور شوریٰ پر ہی مبنی تھی، یہ عرب لوگ جب سرزمینِ ایران میں داخل ہوئے تو عربوں اور ایرانیوں کا امتزاج دو زبردست سیاسی اصولوں کا ٹکراؤ تھا جسے وقتی طور پر تو دب کر تسلیم کر لیا گیا، لیکن آہستہ آہستہ اسی اصولی تنازعہ نے شیعہ اور سنی اختلافات کی صورت اختیار کر لی۔ غیر جانبدار نقاد ایڈورڈ براؤن لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یا روحانی جانشین کا انتخاب جمہوریت پسند عربوں کے لیے تو بالکل قدرتی چیز تھا، لیکن ایرانیوں کے نزدیک یہ انتخاب غیر طبعی اور نفرت انگیز تھا، پھر ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ شیعہ اور سنی کا جھگڑا صرف ناموں یا شخصیتوں کا جھگڑا نہیں، بلکہ دو متضاد اصولوں یعنی جمہوریت اور بادشاہوں کے حقِ الٰہی کا جھگڑا ہے، عرب زیادہ تر جمہوریت پسند ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں، لیکن ایرانی ہمیشہ اپنے بادشاہوں کو الٰہی یا نیم الٰہی ہستیاں سمجھتے رہے ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں تیسرا سبب یہ ہے کہ ان نسلی اور فکری فاصلوں کے ساتھ ساتھ ایک نفسیاتی سبب بھی اس مخالفت میں دخیل رہا، وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی منع فرمودہ متعہ کی کارروائی تھی جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایرانی نوجوانوں کی نظر میں ایک بزرگانہ کڑی نظر بنا دیا تھا، ایران

میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ساسانی سوسائٹی متعہ کی خوگرتھی اور اسے مذہبی تقدس حاصل تھا۔ عربی تمدن اور ایرانی تمدن میں اخلاق بھی ایک بڑا فاصلہ رکھتے ہیں، عرب کسی صورت میں متعہ کو باقی نہ رکھنا چاہتے تھے کہ یہ عمل شرفِ انسانی کے یکسر خلاف تھا اور ساسانی تہذیب کے رسیا اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت سختی سے متعہ سے منع فرمادیا، اس دور میں تو یہ لوگ آپ کے خلاف کچھ نہ کرسکے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ناعاقبت اندیش ایرانی نوجوان نفسیاتی طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مخالف ہوچکے تھے، یہ نفسیاتی وجہ بھی ان اسباب میں سے ہے جس نے ایران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کو اور تیز کردیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں چوتھا سبب ان کا یہود کو خیبر سے نکالنا ہے، یہ یہودیوں کو پورے عرب سے بے دخل کرنے کا سیاسی خاکہ تھا جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا تھا۔ اب یہودیوں کے لیے کوئی اور صورتِ عمل باقی نہ رہی تھی، سوائے اس کے کہ منافقانہ طور پر اسلام میں گھس آئیں اور پھر مسلمانوں میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش اور ذہن سازی کریں اور جب انہیں کوئی راہ نہ ملے تو اسلام کے نظامِ خلافت کو تہ و بالا کردیں، اس تحریک میں جو شخص آگے بڑھا اس کا نام عبداللہ بن سبا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کام کرنے والوں اور خلافتِ راشدہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کو اسی نسبت سے سبائی کہتے ہیں۔

فاروق! فخر و ناز رسالت تم ہی تو ہو — سرمایۂ خلوص و محبت تم ہی تو ہو
حقا دعائے قلبِ نبوت تم ہی تو ہو — واللہ! کبریا کی مشیت تم ہی تو ہو
ہے فخر مصطفیؐ کو تیرے صدق و عشق پر — نازاں ہے جس پر تختِ خلافت تم ہی تو ہو
ملت کو تیری ذات سے حاصل ہوا عروج — دینِ ہدیٰ کی عزت و عظمت تم ہی تو ہو
سینوں سے کر کے دور کدورت کو رنج کو — جس نے دیا پیامِ محبت تم ہی تو ہو
کفار کے دلوں میں ہے اب تک تیرا ہی خوف — مشہورِ خلق جس کی ہے ہیبت تم ہی تو ہو
تسخیرِ مصر و شام اور ایران و روم سے — جس کی عیاں ہے شوکت وسطوت تم ہی تو ہو
تدبیر وعقل وحکمت و دانش سے بے شبہ — جس نے مٹائے کفر و ضلالت تم ہی تو ہو
دے کر شاہِ ایران کی دختر حسینؓ کو — جس نے دیا ثبوتِ محبت تم ہی تو ہو
صدیقؓ جانثار کی مانند بعد مرگ — جس کو کل ہے شرفِ معیت تم ہی تو ہو

بلاغاتِ امام مالکؒ

تعارف اور اِسنادی حیثیت

مولانا محمد ظریف
فاضل ومتخصصِ جامعہ

مؤطا امام مالک کا علمی مقام ''الموطأ'' امام دار الہجرۃ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۹ھ) کی شاہکار تصنیف ہے، جسے بقول علامہ ابن عبد البر مالکیؒ، حضرت امام مالکؒ نے ۴۰ سال میں لکھا ہے۔ (۱) جبکہ حافظ ابونعیمؒ نے ''حلية الأولياء'' میں لکھا ہے کہ ۶۰ سال میں تصنیف کی ہے۔ (۲) اس کتاب کے مرتبہ ومقام کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے: ''ما علی ظهر الأرض كتاب بعد كتاب الله أصح من كتاب مالكؒ.'' (۳) یعنی ''روئے زمین پر امام مالکؒ کی کتاب سے زیادہ صحیح روایات پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے۔'' علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''تنوير الحوالك شرح موطأ مالك'' میں لکھا ہے کہ موطا کی مجموعی مرویات کی تعداد ۱۷۲۰ ہے، پھر ان میں سے ۶۰۰ مسند، ۲۲۲ مرسل اور ۶۱۳ موقوف روایات ہیں، جب کہ ۲۸۵ اَقوالِ تابعین وغیرہ ہیں۔ (۴)

بلاغاتِ امام مالکؒ کا مختصر تعارف

موطا امام مالک سے متعلق عام مباحث سے منفرد بحث ''بلاغاتِ امام مالکؒ'' ہے۔ ''بلاغات'' سے مراد موطا کی وہ روایات ہیں جنہیں حضرت امام مالکؒ نے سند کے بغیر ''بلغني'' یا اس کے ہم معنی الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ ''التمهيد'' میں رقم طراز ہیں:

''باب بلاغات مالك و مرسلاتهٖ مما بلغهٗ عن الرجال الثقات وما أرسلهٗ عن نفسهٖ في موطئهٖ ورفعهٗ إلى النبي صلى الله عليه وسلم وذٰلك أحد و ستون حديثا.'' (۵)

یعنی ''وہ روایات جو امام مالکؒ تک ثقہ لوگوں سے پہنچی ہیں اور وہ جو انہوں نے اپنی طرف سے مرسلاً

بیان کی ہیں اور آپ ﷺ کی طرف منسوب کرکے مرفوع قرار دی ہیں، اِن جیسی روایات کی تعداد ۶۱ ہے۔‘‘

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ’’المسوّیٰ شرح الموطا‘‘ میں لکھا ہے:

’’كان الإمام مالك قرأ كتبا ونسخا لجماعة من أهل العلم، فرواها عنهم بالوجادة، وعبر عن ذٰلك مالك بلفظ بلغهٗ عن النبي صلى الله عليه وسلم.‘‘(۶)

یعنی ’’امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ علم کی ایک جماعت کی مختلف کتابیں اور نسخے پڑھے تھے، اور انہیں ان علماء کی طرف سے وجادہ کے طور پر روایت کرتے تھے، اور ان کتب ونسخ کی روایت کو امام موصوف ’’بلغني عن النبي صلى الله عليه وسلم‘‘ کے الفاظ سے ذکر کرتے تھے۔‘‘

بلاغاتِ امام مالکؒ کی اسنادی حیثیت

بلاغاتِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے: ’’إذا قال مالك: ’’بلغني‘‘ فهو إسناد قويّ.‘‘(۷) یعنی ’’جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ’’بلغني‘‘ کہیں تو وہ قوی سند ہوتی ہے۔‘‘ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ احناف اور مالکیہ کے نزدیک مرسل روایت بلاشرط قابلِ استدلال ہے اور شوافع کے ہاں مرسل روایت بعض شرائط کے ساتھ قابلِ استدلال ہے، ورنہ نہیں، جبکہ بلاغاتِ امام مالکؒ، احناف اور مالکیہ کے ہاں مطلقاً قابلِ احتجاج ہیں، اور شوافع کے ہاں بھی قابلِ استدلال ہیں، کیونکہ بلاغاتِ امام مالک کے لیے مسند روایتوں کی شکل میں مؤیّد روایات موجود ہیں۔(۸) چنانچہ علامہ ابن عبد البرؒ نے ان تمام بلاغات کی سندیں تلاش کی ہیں، تلاش کے بعد سوائے چار روایات کے سب کے سب کی سندیں انہیں ملی ہیں۔

’’تنویر الحوالك‘‘ میں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

’’قال ابن عبدالله: جميع طريق قوله: بلغني و من قوله: عن الثقة عندهٗ مما لم يسندهٗ: أحد وستون حديثا، كلها مسندة من غير طريق مالك إلا أربعة.‘‘(۹)

یعنی ’’امام مالکؒ ’’بلغني‘‘ یا ’’عن الثقة عندي‘‘ جیسے الفاظ کہہ کر جتنی روایات بلا سند لائے ہیں، ان کی تعداد ۶۱ ہے، اور ان میں سے چار روایات کے علاوہ باقی سب روایتیں، امام مالکؒ کے علاوہ دیگر سندوں سے ثابت ہیں۔‘‘

بعد ازاں علامہ ابن صلاحؒ نے ان چار روایات کی اسانید تلاش کیں تو انہیں ان کی سندیں بھی مل گئیں اور ان کے متعلق انہوں نے ایک مستقل رسالہ ’’رسالة في وصل البلاغات الأربعة في المؤطأ‘‘ کے نام سے تالیف کیا، جو شیخ عبداللہ بن صدیق الغماریؒ کی تحقیق اور شیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ کے اعتناء

کے ساتھ دار البشائر الإسلامية بيروت سے شائع ہو چکا ہے۔

وہ چارروایتیں درج ذیل ہیں:

❶- قال حدثنا مالك بن أنس أنه بلغهٔ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إني لا أنسٰى، ولكن أُنسّٰى لأسُنَّ.

❷- قال مالك أنه بلغهٔ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: إذا نشأتْ بحر يّة ثم تشاءمت فتلك عينٌ غديقة.

❸- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أري أعمار الناس قبلهٗ، فتقالّها أو ماشاء الله من ذٰلك، فكأنهٗ تقاصر أعمار أمته أن لا يبلغوا من العمل الذي بلغ غيرهم في طول العمر، فأعطا الله ليلة القدر خيراً من ألف شهر.

❹- عن معاذ بن جبلؓ أنهٗ قال: آخر ما أوصاني به رسول الله صلى الله عليه وسلم حين جعلت رجلي في الغرز، قال: حسّن خلقك للناس معاذ بن جبل۔‘‘(۱۰)

خلاصۂ کلام

①-امام مالکؒ کی کتاب موطا، صحیح احادیث کے مجموعات میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔

②-موطا میں ’’بلغني‘‘ (ومايشابه ذٰلك) کے صیغے سے بلااسناد ذکر کی گئی ۶۱ احادیث کو ’’بلاغاتِ امام مالکؒ‘‘ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

③-چونکہ بلاغاتِ امام مالکؒ دوسری سندوں سے ثابت ہیں، اِس لیے جمہور محدثین عظام وفقہاء کرام کے نزدیک قابلِ استدلال اور قابلِ عمل ہیں، محض سند ذکر نہ ہونے کی وجہ سے ان پر جرح کرنا یا نا قابلِ عمل ونا قابلِ استدلال ٹھہرانا‘ علومِ حدیث سے ناواقفیت کی علامت ہے۔

حوالہ جات

١- الإستذكار، ج:١، ص:٤٩، طبع دار إحياء التراث العربي.
٢- تنوير الحوالك، ص:٣٢، دار الحديث، قاهرة.
٣-أيضاً
٤- أيضاً
٥- التمهيد، ج:٩، ص: ٢٣٤، دار التراث العربي.
٦-المسوىٰ، ج: ١، ص: ٣٥، دار الكتب العلمية، بيروت.
٧-أوجز المسالك (١١١/ ١) طبع شيخ سلطان بن زاهد.
٨- تنوير الحوالك، ص:٣٣.
٩- أيضاً
١٠ -رسالة في وصل البلاغات الأربعة في الموطأ (١٩١ تا ١٩٦) في ضمن خمس رسائل في علوم الحديث بتحقيق الشيخ عبد الفتاح أبو غدة رحمه الله.

حنفی منہجِ افتاء

تعارف واہمیت

مفتی عبید الرحمٰن
مایار، مردان

تقلیدِ شخصی کا پس منظر

سلف کے دور میں تقلید کی ہر دو قسمیں موجود تھیں، بعض لوگ تقلیدِ شخصی کرتے تھے، جبکہ بہت سے لوگ یوں ہی جو عالم مجتہد مل جاتا، ان سے درپیش مسئلہ کا جواب معلوم کر کے عمل کرتے تھے، جو تقلیدِ غیر شخصی کی ایک صورت ہے۔ اس عہد میں تقلیدِ شخصی ضروری نہ تھی، نہ نظریاتی واصولی طور پر ضروری تھی اور نہ ہی عملی طور پر اس کو واجب کا درجہ دیا جاتا تھا، غیر مجتہد شخص کے لیے ضرورت کے وقت تقلید کی ضرورت تو تھی، لیکن تقلید کی دونوں قسموں میں سے خاص تقلیدِ شخصی کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

بعد کے ادوار میں رفتہ رفتہ اس کے ضروری ہونے کے عناصر پیدا ہوتے گئے اور ساتھ ساتھ حکم میں بھی شدت کے دواعی موجود ہونے لگے، جن کی وجہ سے آخرکار ایسا دور بھی آیا جس میں محتاط اور دور اندیش علماء امت نے عام مسلمانوں کے لیے تقلیدِ شخصی کو بہرحال ضروری قرار دیا۔ تقلیدِ شخصی کا یہ وجوب ولزوم چونکہ بذاتہٖ اور لعینہٖ نہیں تھا، اس لیے یہ سوال بے جا ہے کہ جب قرآن وحدیث میں ایک چیز کو واجب قرار نہیں دیا تو بعد کے علماء کیونکر اس بات کے مُجاز ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی طرف سے ایسی غیر ضروری چیز کو ضروری کا درجہ دے دیں؟

منہجِ افتاء مدون ہونے کا تاریخی پس منظر

بہرحال تقلیدِ شخصی کے واجب ہونے کا فیصلہ کیا گیا، اس فیصلے کی برکت سے اُمت کا غالب طبقہ بے جا حریت، خواہش پرستی جیسی خرابیوں سے محفوظ رہا، لیکن زمانے کے بڑھنے، گزرنے کے ساتھ ساتھ فقہی مذاہب میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی، ہر ہر مذہب میں اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اہلِ علم خاصے مقدار میں آتے رہے اور اپنے اپنے اجتہادات وتحقیقات کو مذہب کی کتابوں کا حصہ بناتے رہے۔ اصل مذہب کی بعض باتوں

سے اتفاق، بعض مسائل میں اختلاف اور مختلف اقوال بھی پیدا ہوتے رہے، جس کی وجہ سے چار متبوعہ مذاہب کی ضخامت بڑھتی رہی اور کچھ ہی عرصہ گزر جانے کے بعد ہر مذہب ایک وسیع وعریض صورت میں سامنے آیا، ایک ایک مسئلہ کے متعلق مختلف اقوال، توجیہات وتعلیلات کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہوتا رہا، جس کی وجہ سے صورت حال یہ بنی کہ ہر ہر مذہب مختلف اقوال ودلائل کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔

منہجِ افتاء کی پابندی کی ضرورت

اب جس ضرورت کی وجہ سے خاص تقلیدِ شخصی کو واجب قرار دیا گیا تھا، وہی ضرورت یہاں بھی متحقق ہونے لگی اور اسی کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ فتویٰ دینے کا ایک خاص نہج ترتیب دیا جائے، ورنہ پہلے زمانے میں (اور اب بھی) تقلیدِ شخصی نہ کرنے سے جو شرعی مفاسد اور نقصانات پیش آتے رہے، وہی مفاسد افتاء کا منہج متعین نہ ہونے کی صورت میں تقلیدِ شخصی کے باوجود بھی پیش آسکتے ہیں۔ فقہ وفتویٰ سے شغف رکھنے والے حضرات سے یہ باتیں مخفی نہیں ہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کے تناظر میں تمام اہم مذاہب کے مقلدین حضرات کے ہاں فتویٰ دینے کے مختلف ضوابط مقرر کیے گئے اور اپنے مذہب کے تمام اہلِ علم کو اس ضابطے کا پابند بنایا۔ فقہائے حنفیہ نے بھی اس سلسلے میں کچھ بنیادی اصول وضوابط مقرر فرمائے، جو رفتہ رفتہ ایک فن کی شکل اختیار کر گئے۔

موضوع سے متعلق ایک اہم اور بنیادی کتاب

اس باب میں فقہ حنفی کے اصول وضوابط سے متعلق مشہور کتاب علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کی ''شرح عقود رسم المفتي'' ہے، جس کی ترتیب یہ بنی کہ پہلے آپ نے اس موضوع سے متعلق ایک مختصر نظم تیار کی جو چوہتر (۷۴) اشعار پر مشتمل ہے، اس کے بعد خود ہی اس کی شرح لکھی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فتویٰ دینے کے اکثر اصول وضوابط جمع ہیں جو بڑی محنت، مشقت اور بہت کچھ تلاش وتتبُّع کا نتیجہ ہیں۔ اصل مصادر کا صرف حوالہ ہی نہیں، بلکہ اقتباس کی صورت میں اس کی عبارت بھی لکھی گئی ہے، لیکن ربط وضبط کی قلت نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے کما حقہ اس سے استفادہ کرنا اور مطلوبہ نتائج تک پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا ہے، شاید اسی کا ناگوار نتیجہ ہے کہ سالہا سال سے یہ کتاب پڑھانے والے حضرات بھی عملی طور پر جب فتویٰ تحریر فرماتے ہیں تو متعدد مرتبہ ان اصول کی پابندی نہیں کر پاتے، بار بار یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اسی کتاب کی بعض عبارات سے استدلال واستیناس کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ کتاب پوری طرح منضبط نہیں ہے، اس لیے وہ استدلال بھی صحیح اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا۔ یہ ناکارہ دس سال سے ''رسم المفتي'' پڑھا رہا ہے اور تقریباً ہر سال ان

باتوں کا تجربہ ہوتا رہتا ہے، اس لیے ضرورت محسوس کی کہ ترتیب وانتظام کے ساتھ ان ضوابط کو جمع کر دیا جائے، تاکہ فتویٰ دیتے وقت کام آئیں۔ اسی جذبے کے پیش نظر علامہ شامیؒ کی درج بالا کتاب ''شرح عقود رسم المفتي'' کو سامنے رکھ کر یہ ایک ''ضابطۂ فتویٰ'' ترتیب دیا گیا ہے۔

فتویٰ دینے کا منضبط قاعدہ

جب کوئی مسئلہ درپیش ہو جائے اور اس کا شرعی حل تلاش کرنا ہو تو متقدمین کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے گا، پھر وہ مسئلہ یا تو متقدمین کی کتابوں میں ذکر ہوگا یا نہیں۔

متقدمین نے مسئلہ ذکر کیا ہو

اگر متقدمین (۱) کی کتابوں میں مسئلہ ذکر ہو تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ان کے احکام بھی مختلف ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

①- اگر متقدمین حضرات کا اس مسئلہ میں اتفاق ہو تو اسی اتفاقی قول کو اختیار کیا جائے گا، اگر اتفاق نہ ہو، بلکہ ان کے ہاں بھی اس مسئلہ میں اختلاف کیا گیا ہو تو اس صورت میں:

②- اصحابِ ترجیح کی طرف مراجعت کی جائے گی، اگر ان میں سے کسی صاحب نے کسی قول کو ترجیح دی ہے تو اسی کو اختیار کیا جائے گا اور اگر کہیں اس کی ترجیح مذکور نہ ہو تو اس کا حکم بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

③- بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اصحابِ ترجیح کے درمیان تصحیح وترجیح کے معاملہ میں اختلاف آ جاتا ہے، ایک فقیہ ایک قول کو اختیار کرتا ہے، جبکہ دوسرا فقیہ دوسرے قول کو راجح قرار دیتا ہے، ایسے اختلاف کے وقت درج ذیل طریقوں سے راجح قول کو متعین کیا جائے گا:

الف: ترجیحِ صریح، ترجیحِ التزامی پر مقدم ہوگی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ترجیح کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو یہ ہے کہ کوئی فقیہ کسی قول کو صاف صریح الفاظ کے ساتھ راجح قرار دے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ترجیح کے لیے کوئی لفظ تو استعمال نہ ہو، لیکن اسلوب اور بعض چیزوں کے التزام کی بنیاد پر کسی قول کا رجحان معلوم ہو جائے، پہلی قسم کو ترجیحِ صریح، جبکہ دوسری قسم کو ترجیحِ التزامی کہا جاتا ہے۔ صریح ترجیح کے بھی بیس کے لگ بھگ الفاظ ذکر کیے جاتے ہیں اور التزامی ترجیح کی بھی پندرہ کے قریب صورتیں ذکر کی جاتی ہیں، جن کی تفصیل اسی تحریر میں بقدرِ ضرورت ذکر ہوگی۔

ب: اگر دونوں طرف صریح ترجیح ہوں اور اسی میں تعارض پیدا ہو جائے تو ترجیح کے الفاظ میں مادے کے لحاظ سے ایک کو ترجیح دی جائے گی، جس لفظ کے مادے میں ترجیح کا معنیٰ غالب ہو، اس کو اختیار کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر ایک قول کو ''اظہر'' یا ''احوط'' کہا گیا ہو اور اس کے مقابل دوسرے قول کے لیے ''مفتیٰ بہٖ'' یا ''فتویٰ'' کا مادہ استعمال کیا گیا ہو تو اسی دوسرے قول کو راجح قرار دیا جائے گا۔

ج: استعمال اور صیغہ کے لحاظ سے کسی قول کو ترجیح دی جائے گی، مثال کے طور پر دونوں قولوں کو ایسے الفاظ سے ترجیح دی گئی ہو جن کا مادہ ایک ہو تو اس میں سے اگر ایک طرف اسم تفضیل کا صیغہ موجود ہو تو اسی کو اختیار کیا جائے گا، چنانچہ لفظ ''صحیح'' اور ''أصح'' اگر آپس میں متعارض آجائیں تو بہت سے اہلِ علم کے نزدیک پہلے لفظ کے مقابلہ میں دوسرے لفظ کو اسی بنیاد پر مقدم کیا جائے گا۔ اسی طرح حصر وقصر کے صیغہ کو دوسرے پر مقدم کیا جائے گا، مثال کے طور پر ایک قول کے لیے ''الفتویٰ علیہ'' کا صیغہ استعمال کیا گیا ہو اور دووسرے کے متعلق ''علیہ الفتویٰ'' کی ترکیب استعمال کی گئی ہو تو اسی دوسرے قول کو راجح قرار دیا جائے گا۔

د: ترجیح دینے والے حضرات کے فقہی مقام وطبقہ کو دیکھا جائے گا اور جس کا فقہی طبقہ بلند ہو، اسی کی ترجیح پر عمل کیا جائے گا۔

ھ: اگر ترجیحات میں اختلاف آجائے اور کسی صورت اس میں ترجیح کا کوئی معتد بہ طریقہ موجود نہ ہو(۲) تو اس صورت میں مفتی کو اختیار ہوگا کہ وہ ان دونوں تصحیح شدہ اقوال میں سے جس قول پر چاہے فتویٰ دے سکتا ہے۔ (البتہ اس میں احتیاط کا پہلو اور ضابطہ کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوتِ دلیل وغیرہ مرجحات کو بنیاد بنا کر فتویٰ دیا جائے)۔

متقدمین کے ہاں مسئلہ مذکور نہ ہو

یہ تفصیل تو اس وقت ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں مسئلہ موجود ہو۔ اگر کہیں کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوجائے جس کا متقدمین کی کتابوں میں کوئی سراغ نہ ملے، تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ متأخرین فقہاء اور مشائخ حنفیہ کی کتابوں میں وہ مسئلہ ذکر ہوگا یا نہیں؟

④- اگر متاخرین فقہاء کے یہاں وہ مسئلہ مذکور ہو، تو اگر وہ حضرات کسی ایک قول پر متفق ہوں تو وہی بات راجح قرار پائے گی۔

⑤- اگر متقدمین کے ہاں مسئلہ مذکور نہ ہو اور متاخرین کے یہاں اس میں اختلاف کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں اکثریت کی بات کو ترجیح دی جائے گی۔

متاخرین کے ہاں بھی مسئلہ مذکور نہ ہو

اگر مسئلہ جدید نوعیت کا ہو اور متاخرین مشائخِ احناف نے بھی اس سے کہیں تعرض نہ کیا ہو، تو اس صورت میں:

⑥- عام فرد کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ مستند اہلِ علم کی طرف رجوع کریں اور جو اہلِ علم فقہی ذوق، فتویٰ کا تجربہ اور استخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ قواعدِ مذہب اور اشباہ ونظائر کو سامنے رکھ کر کوئی مناسب حل نکالیں۔

ترجیح صریح کے الفاظ

صریح ترجیح میں وہ تمام الفاظ داخل ہیں جو کسی قول کے راجح ہونے پر کسی درجہ میں دلالت کرتے ہیں، چاہے وہ فتویٰ اور رجحان کے صریح الفاظ ہوں یا ان کے علاوہ۔ اس لحاظ سے اس کے تحت دسیوں الفاظ داخل ہوجاتے ہیں، جن میں سے مشہور الفاظ درج ذیل ہیں:

’’عليه الفتوى. بِهٖ يُفتى. بهٖ نأخذ. وعليه الاعتماد. عليه عمل اليوم. عليه عمل الأمّة. هو الصّحيح. هو الأصحّ. هو الأظهر. هو المختار في زماننا. فتوى مشائخنا. هو الأشبه. هو الأوجه. هو الأحوط.‘‘(۳)

یہ ترجیح صریح کے وہ الفاظ ہیں جو عام طور پر فقہی کتابوں میں ترجیح وتصحیح کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو دیکھ کر راجح قول کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اگر کہیں اس قسم کے الفاظ آپس میں متعارض ہوجائیں کہ مثلاً ایک مسئلہ میں دو اقوال منقول ہیں اور دونوں کے لیے اس طرح ترجیح کے الفاظ بھی ذکر ہوں تو اس صورت میں اس تعارض کے ختم کرنے اور صحیح قول کو متعین کرنے کا طریقہ وہی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

ترجیحِ التزامی کے اسباب ووجوہات

ترجیحِ التزامی کے عام متبادر وجوہات واسباب درج ذیل ہیں:

❶- کسی قول کا ظاہر الروایۃ ہونا وجہ ترجیح ہے، چنانچہ اگر ترجیح صریح موجود نہ ہو تو ظاہر الروایہ کو نادر روایات پر مقدم رکھا جائے گا۔(۴)

❷- قیاس کے مقابلہ میں استحسان کو ترجیح دی جائے گی، البتہ چند ایک مخصوص جگہوں میں قیاس کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

❸- متون شروح سے اور وہ فتاویٰ کی کتابوں پر مقدم ہیں، لہٰذا اگر دو ایسے اقوال میں تعارض دکھائی دے دے جن میں سے ایک قول متونِ معتبرہ میں موجود ہو اور دوسرا صرف شروح میں یا فتاویٰ میں ہو تو شروح کے مقابلہ میں متن والے قول کو اور فتاویٰ میں درج قول کی بنسبت شروح میں مذکورہ قول راجح شمار ہوگا۔

❹- صاحبِ قول کا طولِ ممارست بھی ایک وجہ ترجیح ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر فقہاء نے عبادات کے باب میں حضرت امام اعظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول، قضاء اور اس کے متعلق مسائل کے باب میں حضرت امام ابو

یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول، جبکہ ''ذوي الأرحام'' کے مسائل میں حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

❺ - اکثریت بھی ایک وجہ ترجیح ہے۔ ایک قول میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہو اور اس میں کسی قول کو ترجیح نہ دی گئی ہو تو اکثر فقہاء جس طرف ہیں، اس کو اختیار کیا جائے گا۔ وجہ یہی ہے کہ کم افراد کی بنسبت اکثر افراد کا حق تک رسائی حاصل کرنے کا زیادہ امکان ہے۔

❻ - **ترجیح وتصحیح کی لیاقت رکھنے والے فقیہ کا التزام:** یہ بھی ایک وجہ ترجیح ہے، مثال کے طور پر علامہ فخر الدین قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ''فتاویٰ'' میں لکھا ہے کہ اختلافی مسائل میں جو قول میرے نزدیک راجح ہوگا، میں اس کو پہلے ذکر کروں گا، اور اس کا عملی طور پر التزام کر رکھا ہے۔ اب ''فتاویٰ قاضی خان'' میں کسی قول کا مقدم ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مؤلف کے نزدیک وہی قول زیادہ راجح ہے۔ یہی التزام ''ملتقی الأبحر'' میں بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح صاحبِ ہدایہ کی عادت ہے کہ راجح قول کو آخر میں ذکر کرتے ہیں تو ان کے ہاں یہ چیز التزامی ترجیح کے مترادف ہوگی۔ بعض فقہاء اس بات کا التزام کرتے ہیں کہ اختلافی مسائل واقوال میں جو قول زیادہ راجح ہوتا ہے اس کی دلیل وتعلیل ذکر کرتے ہیں، جبکہ دیگر اقوال کی علت ذکر نہیں کرتے، تو ان کے ہاں یہی تعلیل قابلِ ترجیح (التزامی) ہوگی۔

❼ - کسی قول کو صراحت کے ساتھ تو ترجیح نہ دی گئی ہو، لیکن اس میں کوئی وجہ ترجیح موجود ہو، مثال کے طور پر:

الف: کسی قول کی دلیل کا واضح طور پر مضبوط ہونا۔

ب: کسی قول کا زمانے کے تقاضے کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہونا۔

ج: کسی قول کا وقف کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہونا۔

د: کسی قول کا مذہب کے عام قواعد وضوابط کے قریب تر ہونا۔

ھ: کوئی قول ایسا ہو جس کو اختیار کرنے کی صورت میں کسی مسلمان کا ایمان واسلام بچ سکے اور اس کو کافر ومرتد کہنے سے بچاؤ ہو سکے۔

دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینا

جو افراد اجتہادی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے لیے تقلیدِ شخصی عام حالات میں ضروری ہے اور اپنے مذہب سے نکل کر دوسرے مذاہب کے کسی قول پر فتویٰ دینا عام حالات میں ممنوع ہے، بعض مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے، جس کے لیے بنیادی طور پر درج ذیل شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

الف: واقعۃً کوئی ضرورت درپیش ہو اور اسی کی خاطر دوسرے مذہب کی طرف جایا جائے، اور ظاہر ہے کہ اس طرح ضرورت کے متحقق ہونے کا فیصلہ کرنا ہر ماوشما کا کام نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے خاص درجہ کا فقہی ذوق ومہارت ضروری ہے، لہٰذا محض سہولت پسندی کے جذبے سے ایسا کرنا درست ہے اور نہ فقہ وفتویٰ کے ذوق سے نابلد افراد کا فیصلہ معتبر ہے۔

ب: جس مذہب کے مسئلہ کو لینا ہو، اس کو تمام شرائط اور حدود وقیود کے ساتھ لیا جائے، اس میں محتاط اور بہتر صورت یہی ہے کہ متعلقہ مذہب کے مستند اہلِ فتویٰ علماء کرام سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

ج: تلفیقِ مذموم کی صورت اختیار نہ کی جائے۔ تلفیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک ہی عمل کے ایک جزء میں ایک مذہب کی بات لی جائے اور دوسرے اجزاء میں دوسرے مذاہب کے احکام کو لیا جائے اور اس کے نتیجے میں کوئی ایسا عمل وجود میں آئے جو کسی بھی مذہب میں درست نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

حواشی وحوالہ جات

۱: متقدمین اور متاخرین سے کون کون حضرات مراد ہیں؟ اور اس کا معیار کیا ہے؟ اس کی تعیین میں آراء مختلف ہیں:

۱- تیسری صدی ہجری کے اختتام تک جو علماء گزرے ہیں، وہ متقدمین اور اس کے بعد متاخرین کہلاتے ہیں۔ ۲- امام محمد رحمہ اللہ تک کے فقہاء متقدمین ہیں اور اس کے بعد متاخرین۔ ۳- جنہوں نے امام صاحب یا حضرات صاحبین رحمہما اللہ کا زمانہ پایا ہے، وہ متقدمین ہیں اور اس کے بعد متاخرین ہیں۔ اس کو اختلافِ اقوال پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے اور موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کے اختلاف پر بھی حمل کرنا ممکن ہے۔

۲: یعنی صریح اور التزامی اسبابِ ترجیح میں سے کوئی سبب موجود نہ ہو تب مفتی کو اختیار ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختیار دینے کے لیے صرف ترجیح کے الفاظ واسباب کا متعارض ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دونوں متعارض وجوہ کا جائزہ لیا جائے اور دیگر مرجحات کو سامنے رکھ کر زیادہ راجح قول کا تعین کیا جاسکے۔ اس تفصیل سے فتویٰ کے کام کی نزاکت وپیچیدگی کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۳: شرح عقود رسم المفتي، ص:۹۷

۴: ظاہر الروایۃ کا معیار ومدار کن کتابوں پر ہے؟ اور اس میں امام محمد رحمہ اللہ کی کون کونسی کتابیں داخل ہیں: اس میں بھی اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں: بعض حضرات کے نزدیک امام محمد رحمہ اللہ کی چھ کتابیں ظاہر الروایۃ کا مصدر ہیں، وہ چھ کتابیں یہ ہیں: الجامع الصغير. الجامع الكبير. السير الصغير. السير الكبير. كتاب الأصل. ز يادات. علامہ شامی رحمہ اللہ نے ''شرح عقود'' متن وشرح میں اسی قول کو اپنایا ہے اور مشہور قول بھی یہی ہے۔

بعض حضرات کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ سیر کبیر وصغیر اس میں داخل نہیں ہیں، (ملاحظہ ہو: فتح القدير، باب الإجارة الفاسدة، ج:۸، ص:۳۳۳) جبکہ بعض محققین کا موقف یہ ہے کہ سیر صغیر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت كتاب الأصل ہی کی کتاب السیر ہے جو ''السير الكبير'' کی بنسبت ''صغیر'' کہلائی، ''كتاب الأصل'' کے محقق دکتور محمد بوینوکالن نے بھی اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو: مقدمہ کتاب الاصل، ص:۳۳)، اس لیے اس قول کے مطابق ظاہر الروایۃ کا اصل ومصدر بقیہ پانچ کتابیں ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

عقلی فنون پڑھنے کے فائدے

مفتی محمد طارق محمود
جامعہ عبداللہ بن عمرؓ، لاہور

دینی تعلیم کے نصاب میں منطق، فلسفہ، اصولِ مناظرہ وغیرہ عقلی فنون اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھیں نصاب میں کیوں رکھا گیا ہے؟ انھیں نہ پڑھنے سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ انھیں کس حیثیت سے اور کس حد تک پڑھنا چاہیے؟ زیرِ نظر مضمون میں یہ سب امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔

❶ - عقلی فنون ذریعہ ہیں، بذاتِ خود مقصد نہیں

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ) سے سوال کیا گیا:

''تعلم المنطق حرام أو مباح أو فرض أو واجب أم حسن؟ و إذا كان مباحا بقدر الإصطلاح فماقدرهٗ؟ وهل قراء ة سلم العلوم وشروحهٖ على قدر الإصطلاح جائز أم لا؟.''

''منطق سیکھنا حرام ہے یا مباح یا فرض یا واجب یا حسن؟ اور جب مباح ہے تو اس کی مقدار کیا ہے؟ کیا سلم اور اس کی شروح پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔''

''فأجاب : العلم المنقول كالأغذية مقصود، والمعقول كالأدو ية ضروري لمن يشتغل بالكفاية من المنقول ولم يسلم ذهنهٗ عن الخطأ في الاستدلال بدونهٖ. ولما كان الضروري يتقدر بقدر الضرورة، وقدرهٗ مختلف باختلاف الأذهان، فبأي مقدار ترفع الضرورة كان الضروري هو ذاك المقدار. ومن لاضرورة لهٗ ولاضرر كان لهٗ مباحا. ومن تضرر بهٖ كان لهٗ مذموما. و بقدر التضرر يكون الذم من الكراهة والحرمة.''

''علمِ منقول غذا کی طرح مقصود ہے، اور علمِ معقول دوا کی طرح ذریعہ ہے، اس شخص کے لیے جو فرضِ کفایہ علمِ دین حاصل کرنے میں مشغول ہو اور اس کا ذہن اس کے بغیر دلیل بنانے میں

غلطی سے محفوظ نہ رہے، اور جب ذریعہ بقدرِ ضرورت لیا جاتا ہے اور اس کی مقدار مختلف ذہنوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے، تو جس مقدار سے ضرورت پوری ہوجائے اتنی مقدار کافی ہوگی، اور جسے کوئی ضرورت نہ ہو اور نہ کوئی نقصان ہو اس کے لیے مباح ہے، اور جسے اس سے نقصان ہو اس کے لیے برا ہے۔ اور جتنا نقصان ہو اتنی ہی برائی ہوگی حرمت اور کراہت میں سے۔'' (امداد الفتاوی: ۴/ ۷۷، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

یہ سوال اگرچہ منطق کے بارے میں تھا، لیکن باقی معقولات کا حکم بھی جواب سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ (متوفی: ۱۳۰۲ھ) کا ارشاد ہے:

''ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میرزاہد اور امورِ عامہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی، یہ بات بڑی قوت سے فرمائی اور واقعی موٹی بات ہے۔ دیکھیے! باغ کی رونق کے لیے جیسا کہ پھلوں کے درخت لگانا مقبولِ خدمت ہے، ویسے ہی یہ بھی مقبولِ خدمت ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے کانٹے جمع کر کے باغ کے چاروں طرف باڑھ لگا دے، تاکہ جانور آ آ کر اس کو ویران نہ کر دیں۔ بس فلسفہ ومعقولات کی یہی مثال ہے کہ وہ کانٹوں کی باڑھ ہے۔ اور یہ خدمت بھی اس اصل خدمت کے ساتھ ملحق ہے۔'' (ملفوظاتِ حکیم الامت: ۱۰/ ۷۷، ۷۸، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ)

پس واضح ہوا کہ عقلی فنون کو اسی درجے میں رکھنا چاہیے جس درجے میں صرف، نحو، بلاغت وغیرہ ادبی فنون کو رکھا جاتا ہے، جیسے وہ ذریعہ ہیں ایسے ہی یہ بھی ذریعہ ہیں۔ مقصد دونوں کا دینی علوم: تفسیر، حدیث اور فقہ کی خدمت ہے، اور سلف صالحین کو جیسے ادب وبلاغت پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی، ایسے ہی عقلی فنون حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، ان کی طبیعت کی سلامتی اور سلیقہ ان چیزوں سے کافی تھا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۵۰۵ھ) نے اصولِ فقہ پر اپنی کتاب کے مقدمے میں مبادیِ منطقیہ ذکر فرمائے ہیں، ان کے شروع میں فرماتے ہیں:

'' وليست هٰذه المقدمة من جملة علم الأصول ولا من مقدماته الخاصة به، بل هي مقدمة العلوم كلها، ومن لا يحيط بها فلا ثقة لهٗ بعلومه أصلا. ''

(المستصفى، ص: ۱۰، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط: ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۳ء)

''اور یہ مقدمہ (صرف) علم اصولِ (فقہ) کا حصہ نہیں، اور نہ ہی اس کے خاص مقدمات کا حصہ ہے، بلکہ یہ سب علوم کا مقدمہ ہے، اور جو اس پر عبور نہ رکھتا ہو اسے اپنے علوم پر بالکل بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔''

شاطبی رحمہ اللہ (متوفی: ۷۹۰ھ) کہتے ہیں:

''وكذلك أصول الدين وهو علم الكلام إنما حاصلهٗ تقرير لأدلة القرآن والسنة أو ماينشأ عنها في التوحيد وما يتعلق به كما كان الفقه تقريرا لأدلتها في الفروع العملية.'' (الاعتصام: ۱/ ۴۴، مکتبۃ التوحید، سن ندارد)

''اور اسی طرح اصول الدین اور وہ علم کلام ہے، اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ قرآن وسنت کے توحید وغیرہ کے دلائل کی پوری تفصیل کی جائے، جیسے فقہ قرآن وسنت کے فروعِ عملیہ سے متعلق دلائل کی پوری تفصیل ہے۔''

❷ -معقولات کا اثر دوسرے علوم پر

جب کبھی حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۶ھ) کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درسِ نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل دیس نکالا دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جو ہمارا گراں قدر علمی سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفے کی تعلیم سے ذہن کو جلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ اور اس طرح یہ علوم: تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ کے مسائل سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ (البلاغ مفتی اعظمؒ نمبر: ۱/ ۳۵۸، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۲۶ھ) نیز دیکھیے: آداب البحث والمناظرة، محمد امین قیطی سلفیؒ (متوفی: ۱۳۹۳ھ) اس میں مؤلف نے دو فنون جمع کیے ہیں: منطق اور اصولِ مناظرہ۔

اصولِ مناظرہ بھی ایک ضروری فن ہے۔ مباحثہ اصول وضوابط کا پابند ہو تو نتیجہ خیز ہوتا ہے، ورنہ نرا شور شرابا۔ اس کی اصطلاحات دوسرے علوم وفنون میں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ یہ پہلے نصاب میں داخل تھا، اب کچھ عرصے سے معلوم نہیں کیوں نکال دیا گیا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو دینی تعلیم کے مختصر نصاب ''ضمان التكميل في زمان التعجيل'' میں بھی اصولِ مناظرہ کا ایک متن شامل رکھا ہے۔ علمِ اصولِ مناظرہ دراصل اصولِ فقہ کی بحث دفع القیاس سے کچھ ترمیم کے ساتھ ماخوذ ہے۔ (دیکھیے: نور الانوار، ص ۲۴۹، ایچ ایم سعید، کراچی، سن ندارد) اس لیے طلبہ کو کم از کم شریفیہ کا متن تو ضرور پڑھا دینا چاہیے۔

❸ - جسے معقولات سے مناسبت نہ ہو اسے یہ نہ پڑھائے جائیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے پاس اکثر طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ منطق سمجھ نہیں

آتی، کوئی دعا لکھ دیجیے، میں لکھ دیتا ہوں کہ منطق پڑھنا چھوڑ دو، یہی دعا ہے: ''إذا لم تستطع شیئًا فدعه.'' (جب تمہیں کسی کام کی طاقت نہ ہوتو اسے چھوڑ دو) آج کل بعض طبائع کو معقول سے مناسبت نہیں، سو ایسوں کو معقول نہ پڑھائیں اور صرف دینیات کے بعد تکمیل کی سند دے دیں۔ کانپور میں بعض طلبہ محض دینیات پڑھتے تھے، معقولات نہیں پڑھتے تھے تو ان کو پہلے سند نہیں ملتی تھی۔ میں نے کہا: افسوس عالم دینیات کو سند نہ ملے اور معقولات نہ ہونے کی وجہ سے اس کو ناقص سمجھا جائے، اسی وجہ سے میں نے دو قسم کی سندیں تیار کرائی تھیں، اور ایک میں لکھ دیا تھا: ''فارغ عن الدرسیات''، دوسری میں ''فارغ عن الدینیات''، اور جس کو منطق سے مناسبت نہ ہو اس کو بعض ایسی کتبِ دینیہ جیسے توضیح تلویح، مسلم الثبوت جن میں منطقی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، ان کا پڑھنا بھی ضروری نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۹/ ۳۹۰، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۵ھ) ان میں سے ایک سند کا عنوان: ''سند البلاغ إلی کمال الفراغ من الدینیات'' تھا۔ اور دوسری کا عنوان: ''سند البلاغ إلی کمال الفراغ من الدرسیات'' تھا۔ (دیکھیے: اشرف السوانح: ۱/ ۹۰-۹۳، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۷ھ)

❹ -معقولات کی مذمت کے اقوال کے معانی

بعض شافعی علماء سے منطق کے اوراق سے استنجاء کرنے کا قول منقول ہے، فقہ شافعی کی معتبر کتاب ''تحفة المحتاج'' سے اس کی مراد دیکھیے:

'' (علم محترم کمنطق وطب خلیا عن محذور کالموجودین الیوم، لأن تعلمهما فرض کفایة لعموم نفعهما) (قوله: لأن تعلمهما الخ) قال في الإمداد: بل هو أي المنطق أعلاها أي العلوم الآلیة. وإفتاء النووي کابن الصلاح بجواز الاستنجاء به یحمل علی ماکان في زمنهما من خلط کثیر من کتبه بالقوانین الفلسفیة المنابذة للشرائع، بخلاف الموجود الیوم، فانهٗ لیس فیه شيء من ذٰلك ولا مایؤدي إلیه فکان محترما، بل فرض کفایة، بل فرض عین إن وقعت شبهة لایتخلص منها إلا بمعرفته. انتهٰی.''

''بلکہ علمِ منطق علومِ آلیہ میں سے سب سے بڑے درجے کا ہے۔ اور نووی اور ابن صلاح کا یہ فتویٰ کہ منطق (کے اوراق) سے استنجاء کرنا درست ہے، اس سے مراد وہ منطق ہے جو ان کے زمانے میں تھی، جس میں خلافِ شرع بہت سے فلسفی قوانین ملے ہوئے تھے، برخلاف موجودہ منطق کے، کیونکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں، تو یہ قابلِ احترام ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، بلکہ فرضِ عین ہے، اگر کوئی ایسا شبہ پیش آیا جس سے منطق جانے بغیر نہ نکل سکے۔''

(تحفۃ المحتاج فی شرح المنہاج وحواشی الشروانی والعبادی: ۱/ ۱۷۸، المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ط: ۱۳۵۷ھ - ۱۹۸۳ء، نیز دیکھیے: ردالمحتار: ۱/ ۴۵، دارالفکر، بیروت، ط: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء، جامع الرموز مع غواص البحرین: ۳/ ۶۷۴، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ط: ۲۰۱۸ء)

علمِ کلام کی مذمت کے اقوال بھی سلف سے منقول ہیں، جیسے مثلاً امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۸۲ھ) فرماتے ہیں: ’’من طلب الدين بالكلام تزندق‘‘ ’’جو دین کو علم کلام سے طلب کرے وہ زندیق ہے۔‘‘

اسی طرح اور ائمہ سے بھی مذمت کے اقوال منقول ہیں۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۷۱ھ) فرماتے ہیں:

’’وفي كل ذٰلك دلالة على أن استحباب من استحب من أئمتنا ترك الخوض في الكلام إنما هو للمعنى الذي أشرنا إليه وأن الكلام المذموم إنما هو كلام أهل البدع الذي يخالف الكتاب والسنة. فأما الكلام الذي يوافق الكتاب والسنة و يبين بالعقل والعبرة، فإنهٗ محمود مرغوب فيه عند الحاجة تكلم فيه الشافعي وغيرهٗ من ائمتنا رضي الله عنهم عند الحاجة كما سبق ذكرنا له.‘‘ (تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الأشعری: ص ۳۵۱، دارالکتاب العربی، بیروت، ط: ۱۴۰۴ھ)

’’ان سب واقعات میں اس کی دلیل ہے کہ ہمارے جن ائمہ نے (علم) کلام میں مشغول ہونے کو پسند نہیں کیا، اس کی وجہ وہ تھی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، اور یہ کہ کلامِ مذموم صرف وہ ہے جو اہلِ بدعت کا ہے جو کتاب وسنت کے مخالف ہے، اور جو علمِ کلام کتاب وسنت کے موافق ہو اور عقل سے وضاحت کرے وہ بوقتِ ضرورت پسندیدہ ہے، اس میں ہمارے ائمہ شافعی وغیرہ نے حصہ لیا ہے۔‘‘

امام بیہقی رحمہ اللہ (متوفی: ۴۵۸ھ) نے بھی امام شافعی رحمہ اللہ (متوفی: ۲۰۴ھ) کے مذمت کے قول کی یہی مراد بیان کی ہے۔ (نیز دیکھیے: تبیین کذب المفتری، ص: ۳۳۴ - ۳۵۲۔ اشارات المرام، ص: ۱۱۷ - ۱۲۶، زمزم، کراچی، ط: ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء)

اس سے واضح ہوا کہ علمِ کلام کی مذمت میں منقول سلف کے اقوال اپنے ظاہر اور اطلاق پر نہیں، لہٰذا ان اقوال سے عموم مراد لے کر اہلِ سنت والجماعت کے متکلمین کی علی الاطلاق مذمت کرنا اور انھیں گمراہ قرار دینا خود گمراہی میں پڑنا ہے۔ شرح عقائدِ نسفیہ کے خطبے میں تفتازانی رحمہ اللہ (متوفی: ۷۹۲ھ) نے بھی ان اقوال کے کچھ معانی ذکر کیے ہیں۔ (دیکھیے: شرح عقائدِ نسفیہ، ص: ۸، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ط: سنہ ندارد)

5-علمِ کلام کی تدوین کا تاریخی پس منظر

علمِ کلام کی تدوین کی ضرورت اور تاریخی پس منظر کو اگر دیکھا جائے تو اس سے بھی ائمہ کے مذمت کے اقوال کی مراد سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (متوفی: ۱۴۲۰ھ) لکھتے ہیں:

''(عباسی خلیفہ) معتصم باللہ (۱۷۹-۲۲۷ھ) اور واثق باللہ (۲۰۰-۲۳۲ھ) کے انتقال پر (جو مذہبِ اعتزال اور معتزلہ کے سر پرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا۔واثق کا جانشین خلیفہ متوکل علی اللہ (۲۰۵-۲۴۷ھ) مذہبِ اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا۔اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت واقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا۔خلقِ قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے۔معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا۔اور قضا وافتاء اور حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے۔تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہو گیا۔عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر، وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں۔اور ان کی آراء وتحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے۔

امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴-۲۴۱ھ) کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقتور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔محدثین اور ان کے ہم مسلک علماء نے علومِ عقلیہ اور نئے طریقہ بحث ونظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج چل پڑا تھا)، توجہ نہیں کی۔نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی۔اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلڑا بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکماتِ شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسنِ تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متأثر ہوتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہرِ شریعت اور مسلکِ سلف کی علمی بے توقیری اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔خود محدثین اور اُن کے تلامذہ کے گروہ کے بہت سے لوگ احساسِ کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہو رہے تھے۔یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لیے سخت خطرناک تھی۔قرآن مجید کی تفسیر اور عقائدِ اسلام ان فلسفی نما مناظرین کے لیے بازیچۂ اطفال بنے جا رہے تھے۔مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی۔یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی، اور

اصطلاحات کی معرکہ آرائی، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے نہ تو محدثین وحنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں وزاہدوں کا زہد وعبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات ومسائل پر ان کا عبور واستحضار۔ (اور ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ معتزلہ سے ان کی زبان اور اصطلاح میں بات کرکے انھیں بند کیا جاتا، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا، اس پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو علم کلام کی علی الاطلاق مذمت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔)

اس کے لیے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچے سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نورد رہ چکا ہو، جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت اور فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں اور ایسے پست وحقیر نظر آتے ہوں، جیسے کسی دیوقامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نوعمر بچے، اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام اہلِ سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعریؒ (۲۶۰-۳۲۴ھ) کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔'' (تاریخِ دعوت وعزیمت: ۱/ ۱۰۳-۱۰۴، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، سنہ ندارد)

''امام ابوالحسن اشعریؒ نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل اور متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف عمل کرسکے، اور اس کے جزئیات وتفصیلات اور ذات وصفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرسکے اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ وہ بعض پرجوش محدثین وغالی حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائدِ اسلامیہ کی حفاظت کے لیے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی واعتقادی مباحث جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہوگئے تھے، احتیاط وسکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے، جس سے مذہب وعقائدِ اہلِ سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا۔'' (مصدرِ سابق: ۱/ ۱۰۸)

''ان (امام ابوالحسن اشعریؒ) کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنت اور عقیدۂ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائیدنہیں، یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کرہی رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب وسنت کے ان حقائق اور اہلِ سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا، اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کرکے عقائدِ اہلِ سنت کی صداقت اور ان کا منقول ومعقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔ دین کی (اس) اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کے

معتوب بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا،لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث ومسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک زیغ وضلال کی بات تھی۔''

(مصدرِسابق:۱/ ۱۱۰-۱۱۱۔نیز دیکھیے:الملل والنحل للشہرستانی:۱/۳۱،موٴسسۃ الحلبی)

شیخ ابن تیمیہؒ(متوفی:۷۲۸ھ)فرماتے ہیں:

''فإن أحمد لم ينه عن نظر في دليل عقلي صحيح يفضي إلٰى مطلوب، بل في كلامه في أصول الدين في الرد على الجهمية وغيرهم من الاحتجاج بالأدلة العقلية علٰى فساد قول المخالفين للسنة ما هو معروف في كتبه وعند أصحابه. ولٰكن أحمد ذم من الكلام البدعي ما ذمهٗ سائر الأمة، وهو الكلام المخالف للكتاب والسنة والكلام في الله ودينه بغير علم.''

(درء تعارض العقل والنقل:۷/ ۱۵۳- ۱۵۴، جامعۃ محمد بن سعود، ط: ثالثۃ،۱۴۱۱ھ-۱۹۹۱ء)

''امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مطلوب تک پہنچانے والی صحیح دلیلِ عقلی میں غور کرنے سے نہیں روکا، بلکہ جہمیہ وغیرہ کے رد میں اصولِ دین پر ان کے کلام میں دلائلِ عقلیہ سے سنت کے مخالفین کے قول کا فساد ثابت کیا گیا ہے، جو کہ ان کی کتابوں اور ان کے تلامذہ کے ہاں معروف ہے،لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کلامِ بدعی کی مذمت کی ہے جس کی سب نے مذمت کی ہے،اور وہ کتاب وسنت کے مخالف کلام ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے دین میں بغیر علم کے کلام ہے۔''

اور فرماتے ہیں:

''الأشعرية فيما يثبتونهٗ من السنة فرع على الحنبلية، كما أن متكلمة الحنبلية فيما يحتجون به من القياس العقلي فرع عليهم، و إنما وقعت الفرقة بسبب فتنة القشيري.'' (مجموع الفتاویٰ:۶/ ۵۳،مجمع الملک فہد،ط:۱۴۲۵ھ)

''اَشاعرہ سنت کو ثابت کرتے ہیں تو حنابلہ کی مدد سے، جیسے حنابلہ کے متکلمین قیاسِ عقلی سے دلیل لیتے ہیں تو اشاعرہ کی مدد سے، جدائی بس فتنۂ قشیری کے سبب ہوئی، (ورنہ حنابلہ اور اشاعرہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار رہیں)۔''

اور فرماتے ہیں:

''ولهٰذا اصطلحت الحنبلية والأشعرية واتفق الناس كلهم ..... وصار الفقهاء من الشافعية وغيرهم يقولون الحمد لله على اتفاق كلمة المسلمين.''(ایضاً:۳/۲۶۹)

’’اسی وجہ سے حنابلہ اور اشاعرہ میں صلح ہوگئی اور سب لوگ اِکٹھے ہوگئے .... اور فقہائے شافعیہ وغیرہ کہنے لگے: مسلمانوں کے اتفاق پر اللہ کا شکر ہے۔‘‘

اس سے واضح ہوا کہ ہمارے زمانے میں اشاعرہ اور حنابلہ میں جو آتشِ جنگ دوبارہ بھڑکائی جارہی ہے، یہ اسلام اور اہلِ اسلام کی کوئی خدمت نہیں!‘‘ (نیز دیکھیے: تبیین کذب المفتري فیما نسب الی الاشعري، ص:۱۶۳)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’آج کل بعض لوگوں کو علمِ کلام جدید کی تدوین کا خبط ہو رہا ہے، بس اس خیال سے اس کو جدید کہہ لو کہ تمہارے شبہات جدید ہیں، ورنہ علمِ کلامِ قدیم کے قواعدِ قیامت تک کے شبہات کا جواب دینے کے لیے کافی ہیں، چنانچہ میرا ایک رسالہ ہے: ’’الانتباهات (المفيدة)‘‘ وہ تمام شبہاتِ جدیدہ کے ازالہ کا کفیل ہے۔ ذرا کوئی اس کے اصول کو توڑ تو دے، ان شاءاللہ! قیامت تک کوئی نہ توڑ سکے گا۔ وہ رسالہ علم کلام قدیم ہی کے قواعد سے لے کر لکھا گیا ہے، پس علمِ کلامِ جدید کا خیال محض خبط ہے۔ متقدمین کے اصول سب شبہات کے دفع کے لیے کافی ہیں۔‘‘ (خطباتِ حکیم الامت: ۲۳/ ۱۱۹-۱۲۰، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۸ھ)

الانتباهات المفيدة کا انگریزی میں بھی ترجمہ طبع ہو چکا ہے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری اور پروفیسر کرار حسین نے کیا ہے۔ اس کا نام ہے: Answer to Modernism۔ انٹرنیٹ آرکائیو سے فری ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔

❻-فنِ دانش مندی

معقولات کے ساتھ ایک اور چیز کا تعلق ہے: وہ ہے فنِ دانش مندی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۱۷۶ھ) نے اس پر دانش مندی کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں: ’’اگر تم یہ پوچھو کہ دانش مندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں؟ تو دانش مندی سے میری مراد کتاب دانی ہے، اور اس کے تین درجے ہیں۔‘‘ اس رسالے میں حضرت نے فنِ دانش مندی میں امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ تک اپنی سند کا بھی ذکر کیا ہے، اور کل ۱۵/اصول ذکر کیے ہیں جن سے طالب علم کو کتاب صحیح طرح سمجھنے اور تحقیق کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اور فرمایا ہے کہ علمِ کلام اور اصولِ (فقہ) بھی اس فن سے مخلوط ہیں، اصل رسالہ فارسی میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ماہنامہ فکر ونظر اسلام آباد میں شائع ہوا ہے، اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ اصل رسالہ شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے رسالے تکمیل الأذهان کے ساتھ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے مطبوع ہے۔

(نیز دیکھیے: نظامِ تعلیم وتربیت: ۱/ ۱۸۷، مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ط: اول)

❼-معقولات نہ پڑھنے کا نتیجہ

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ اپنے سفرنامے میں فرماتے ہیں: ''اگلے دن مغرب کے بعد شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مدرسے میں شیخ عبد الکریم المدرس کی زیارت نصیب ہوئی۔ انھوں نے عصری جامعات کے ڈگری زدہ طریقے کے بجائے قدیم طریقے پر ماہر اساتذہ وشیوخ سے علومِ دینیہ کی تکمیل فرمائی ہے۔ ماجستیر اور دکتوراہ کے اس دور میں ایسے علماء کی قدر و قیمت پہچاننے والے بہت کم ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ علمِ دین کی جو خوشبو اور شریعت وسنت کی جو مہک ان بوریہ نشینوں کے پاس محسوس ہوتی ہے وہ عموماً یونیورسٹیوں کی عالیشان عمارتوں اور ان کے پرتکلف ماحول میں نظر نہیں آتی، اس لیے جہاں جانا ہوتا ہے ایسے علماء کی تلاش رہتی ہے۔ شیخ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے کہ ناچیز کو انہی پرانے طرز کے دینی مدارس اور ان کے علماء سے خادمانہ نسبت ہے، چنانچہ ابتدائی سلام کلام کے بعد ان کا پہلا سوال ہمارے مدارس کے نصاب ونظام سے متعلق تھا۔ اور جب میں نے اپنی درسی کتب میں کافیہ، شرح جامی، شرح تہذیب، نور الانوار اور توضیح جیسی کتب کا نام لیا تو وہ تقریباً چیخ پڑے، اور وصیت فرمائی کہ اس قسم کی ٹھوس استعداد پیدا کرنے والے نظامِ تعلیم کو آپ کبھی نہ چھوڑیے، کیوں کہ ہم اس نظام کو چھوڑنے کے نتائج بد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔'' (جہانِ دیدہ، ص: ۲۲-۲۳، ملخصاً بلفظہ، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

ان کتب میں شرح تہذیب تو خاص فن منطق میں ہے۔ نور الانوار اور توضیح اصول فقہ میں ہیں اور منطق اصولِ فقہ کے مبادی میں سے ہے، اور کافیہ اور شرح جامی بھی معقولی اسلوب اور منہج میں ہیں۔

برہانِ تمانع میں کسی خراسانی کا ایک رسالہ ہے، اس نے ملازمہ عادیہ اور ملازمہ عقلیہ میں فرق نہیں کیا اور اپنے سارے کلام کی بنیاد اسی پر رکھی ہے، خود بھی غلطی میں پڑا اور دوسروں کو بھی غلطی میں ڈالا، اور اس کا خیال یہ ہے کہ وہ سعد الدین (تفتازانی جیسے ماہرین فن) کو غلط قرار دینے میں حق بجانب ہے!۔ (كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون: ١١٤٥/ ٢، مكتبة المثنى، بغداد، ط: ١٩٤١ء)

تاہم یہ بات واضح ہے کہ عقلی فنون کو غور سے سمجھ کر پڑھنے سے ہی مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، اس کے لیے مستقل طور پر ذہنی ورزش کی ضرورت ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ شروح وحواشی کا گہری نظر سے لگاتار مطالعہ کر کے وہ انداز اپنے اندر جذب کیا جائے۔ امتحان کے قریب سرسری طور پر کچھ یاد کر کے امتحان میں نمبر لے لینا کافی نہیں، اور امتحان بھی ایسا ہونا چاہیے جس میں طلبہ کے حافظے اور کتابت کے بجائے صلاحیت اور استعداد کی جانچ ہو۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

تعوُّذات

مولانا عبدالستار
جامعہ نعمانیہ، لیاری، کراچی

تعارف، اہمیت، فوائد

ذخیرۂ احادیث کو دیکھا جائے تو ہر موقع ومحل کے مناسب تعوذ پر رسول اللہ ﷺ کے عملی اہتمام کو دیکھ پڑھ کر قاری، حیرانگی اور تعجب میں پڑ جاتا ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ تعوُّذات' اس قدر اہمیت کے حامل رہے ہیں کہ جنہیں صبح وشام کے وقت، سونے جاگنے، برا خواب دیکھنے، بیمار کی بیمار پرسی، غیض وغضب سے دو چار ہونے، وساوس کی بندش کو توڑنے، سفر کی روانگی، کسی جگہ پڑاؤ، گھر سے خروج، بازار جانے، کوئی چیز خریدنے، بیماری یا بخار میں مبتلا ہونے، سخت آندھی چلنے کے مواقع کے علاوہ نماز کے دوران اور نماز کے بعد پڑھنے کا خاص حکم ہے۔ اور اسی طرح مصائبِ دنیویہ جیسے: برص، جنون، جذام، ذلت، پریشانی، غم، لاچارگی، قرض، فقروفاقہ، بڑھاپے اور ہر قسم کے ناگہانی آفات کے ساتھ ساتھ اُخروی مصائب، مثلاً: نفاق، کفر، شرک، گمراہی، برے اعمال، برے ساتھی اور برے پڑوسی سے مخصوص استعاذہ کا وارد ہونا بھی آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ تعوُّذ کے معنی میں ذرا سا غور کیا جائے اور اس کی حکمتوں کو سوچا جائے، تو ساری حیرانگی، اللہ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار کرتے ہوئے اپنی بے بسی، لاچارگی اور کمزوری سے بدل جاتی ہے کہ انسان کسی بھی آفت، حادثہ یا دشمن کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتا ہے، بلکہ وہ ہر آن، ہر گھڑی، ہر لمحہ اور ہر مصیبت، آفت کے وقت اللہ تعالیٰ کی کامل احتیاج رکھتا ہے، چنانچہ علامہ راغب اصفہانیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المفردات'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''العَوْذ'' دوسرے کی پناہ میں رہنے اور اس کے ساتھ لگے رہنے کو کہتے ہیں اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لیا گیا ہے: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعوُّذ کی وضع، اللہ کی طرف التجاء ہے، مگر حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور نکتہ تحریر فرمایا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعوُّذات کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اِنابت اور متوجہ ہونے کے

ساتھ ساتھ انسان کی لاچارگی، بے بسی اور کمزوری کا اظہار بھی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: کلام عرب میں پناہ پکڑنے کے لیے دو قسم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں: ۱-الْعَوْذُ ، ۲-اللَّوْذُ، مگر ان دونوں کے درمیان ایک باریک فرق ہے، جس سے استعاذہ کا مقصد مزید واضح ہوجاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ لفظ ’’لوذ‘‘ کسی کی پناہ میں اپنے فائدہ کے تحت آنے کو کہتے ہیں، جبکہ ’’عوذ‘‘ اپنے آپ کو شر سے بچانے کے لیے کسی کی پناہ پکڑنے کو کہتے ہیں، اور متنبی کے درج ذیل شعر سے بھی اس فرق کی جھلک نظر آجاتی ہے:

يَـا مَــنْ اَلُــوْذُ بِــهٖ فِيْمَا اُؤَمِّلُهٗ　　مَــنْ اَعُوْذُ بِهٖ مِمَّنْ اُحَــاذِرُهٗ
لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْماً اَنْتَ كَاسِرُهٗ　　لَايَهِيْضُوْنَ عَظْماً اَنْتَ جَابِرُهٗ

مفہوم: ’’اے وہ ذات! جو میری آرزوؤں کا مرکز ہے اور جو میرے لیے بچاؤ اور پناہ کا ذریعہ ہے۔ جس ہڈی کو آپ توڑنا چاہیں تو کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا اور جسے آپ جوڑنا چاہیں، اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔‘‘

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے استعاذہ کے لطائف بیان کرتے ہوئے مقصد کو مزید واضح کردیا:

’’وَمِنْ لَطَائِفِ الِاسْتِعَاذَةِ اَنَّهَا طَهَارَةٌ لِلْفَمِ مِمَّا كَانَ يَتَعَاطَاهُ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَتَطْيِيْبٌ لَهٗ وَهُوَ لِتِلَاوَةِ كَلَامِ اللهِ وَهِيَ اسْتِعَانَةٌ بِاللهِ وَاعْتِرَافٌ لَهٗ بِالْقُدْرَةِ وَلِلْعَبْدِ بِالضَّعْفِ وَالْعَجْزِ عَنْ مُقَاوَمَةِ هٰذَا الْعَدُوِّ الْمُبِيْنِ الْبَاطِنِيِّ الَّذِيْ لَا يَقْدِرُ عَلٰى مَنْعِهٖ وَدَفْعِهٖ اِلَّا اللهُ الَّذِيْ خَلَقَهٗ وَلَا يَقْبَلُ مُصَانَعَةً وَلَا يُدَارٰى بِالْاِحْسَانِ.‘‘ (تفسير الاستعاذة وأحكامها: ١٤/ ١، ط: مكتبة العلوم و الحكم)

’’استعاذہ میں مشغول رہنے سے زبان ہر قسم کے بے ہودہ اور بے کار مشاغل سے دور ہوکر پاکیزہ رہتی ہے اور کلام اللہ کی تلاوت کے لیے تیار رہتی ہے، بلکہ استعاذہ میں اللہ کی مدد مانگنے اور ان کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی لاچارگی اور اپنے اُس کھلم کھلا، آنکھوں سے اوجھل دشمن کے مقابلہ سے ناتوانی کا اظہار بھی ہے، جس کے پچھاڑنے کی طاقت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جس نے اسے پیدا کیا، جس کے یہاں نہ تصنع کا اعتبار ہے اور نہ کاسا لیسی کا۔‘‘

البتہ اگر کسی کے ذہن میں یہ آجائے کہ ہر ’’مستعاذ منہ‘‘ یعنی ہر وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی پناہ مانگی ہے، وہ ہر حال میں مصیبت اور وبال ہی ہے، تو اس حوالہ سے جان لینا چاہیے کہ ہر مستعاذ منہ مصیبت یا وبال نہیں ہے، بلکہ یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے؛ کیونکہ ایک جانب اگر غیر طبعی یا ناگہانی موت سے پناہ مانگی گئی ہے، تو دوسری طرف اسے شہادت بھی کہا گیا ہے، چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیری -رحمہ اللہ- نے مذکورہ مسئلہ کو اپنے اَمالی (العرف الشذي) میں سوال وجواب کی شکل میں بیان کیا، جسے ہم من وعن نقل کرتے ہیں، کیونکہ اس میں پناہ لینے کی حکمت کا بھی ذکر ہے:

’’وإن قيل: إن في أبي داود الاستعاذة من الموت مفاجأة، والحال أن الحديث ينبئ بأن الموت فجاءة شهادة، قلنا: إن الشريعة تأمر بالاستعاذة كيلا يفوت الرجل الوصية وغيرها من أمور الشريعة، وأما لو ابتلي ومات بالموت فجاءة فيكون شهيداً.‘‘ (أبواب الجنائز، باب ما جاء في الشهداء من هم؟ ١/٤٦٩، ط: الطاف اينڈ سنز)

’’اگر کوئی کہے کہ ابوداؤد شریف میں ناگہانی موت سے پناہ مانگی گئی ہے، جبکہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی موت شہادت ہے، تو ہم کہیں گے کہ شریعت پناہ مانگنے کا حکم دیتی ہے، تاکہ وصیت یا معاملاتِ شرعیہ فوت نہ ہوں، باقی ناگہانی طور پر انتقال کر جائے، تو وہ شہید شمار ہوگا۔‘‘

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ حافظ الدنیا حافظ ابن حجر نفعنا اللہ بعلومہٖ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ’’فتح الباري‘‘ میں ایک حدیث کی ترجمة الباب کے ساتھ مناسبت لکھتے ہوئے استعاذہ بالغیر کا حکم بیان کیا کہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی پناہ پکڑ نا درست نہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

’’لٰكِنَّهٗ لَا يُسْتَعَاذُ إِلَّا بِاللهِ اَوْ بِصِفَةٍ مِنْ صِفَاتِ ذَاتِهٖ وَخَفِيَ هٰذَا عَلَى بْنِ التِّيْنِ فَقَالَ: لَيْسَ فِيْهِ جَوَازُ الْحَلِفِ بِالصِّفَةِ كَمَا بَوَّبَ عَلَيْهِ ثُمَّ وَجَدْتُ فِيْ حَاشِيَةِ بْنِ الْمُنِيْرِ مَا نَصُّهٗ قَوْلُهٗ اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ دُعَاءٌ وَلَيْسَ بِقَسَمٍ وَلٰكِنَّهٗ لَمَّا كَانَ الْمُقَرَّرُ اَنَّهٗ لَا يُسْتَعَاذُ إِلَّا بِالْقَدِيْمِ ثَبَتَ بِهٰذَا اَنَّ الْعِزَّةَ مِنَ الصِّفَاتِ الْقَدِيْمَةِ لَا مِنْ صِفَةِ الْفِعْلِ فَتَنْعَقِدُ الْيَمِيْنُ بِهَا.‘‘

(كتاب الأيمان و النذور، باب الحلف بعزة الله وصفاته وكلماته: ١١/٦١٧، ط:دار الحديث)

’’پناہ صرف اللہ تعالیٰ یا اس کی صفاتِ ذاتیہ میں کسی صفت کی لی جاسکتی ہے اور ابن تینؒ پر یہی مخفی رہا تو انہوں نے کہا کہ حدیث میں صفت کے ذریعہ قسم کھانے کی بات نہیں، جیسا کہ قائم کردہ باب سے معلوم ہو رہا ہے۔ پھر میں نے ابن منیرؒ کے حاشیہ میں دیکھا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ’’أعوذ بعزتك‘‘ دعا ہے، قسم نہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ پناہ صرف قدیم کی لی جاتی ہے، تو یہ ثابت ہوا کہ عزت اللہ کی صفاتِ قدیمہ میں سے ہے نہ کہ صفاتِ فعل میں سے، لہٰذا اس سے قسم منعقد ہوجاتی ہے۔‘‘

غالباً انہی اقوال کی بنا پر ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف افشانی صاحب مدظلہم اکثر اپنے بیانات میں فرمایا کرتے ہیں کہ: ’’أعوذ باللہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو دنیاوی اور اُخروی ہر قسم کے مصائب سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے مضبوط قلعہ میں پناہ گزین بنادیتا ہے۔‘‘

انسان کے خمیر میں چوں کہ یہ بات ہے کہ عموماً مطلب اور فائدہ کے بغیر وہ کسی کام کا اقدام نہیں کرتا، اسی لیے ہم اپنے مضمون کے آخر میں استعاذہ کے چند فوائد ذکر کرتے ہیں:

❶-علامہ ابن قیمؒ نے تعوُّذات اور دیگر اذکار کے فوائد تحریر کرتے ہوئے ایک عمدہ فائدہ بیان کیا ہے کہ دوائیاں تب ہی فائدہ اور سود مند ہیں، جب پہلے سے بیماری نے آکر نقصان سے دوچار کیا ہو، جبکہ تعوُّذ کا کمال اور فائدہ یہ ہے کہ یہ بیماری کے اسباب اور انسان کے درمیان سدِ سکندری کی طرح حائل بن جاتی ہے، بہرحال علامہ موصوف کا مطلب یہ ہے کہ تعوُّذات مرض کے خاتمہ، مرض سے پیشگی حفاظت اور صحت کے برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور دلائل سے اپنی بات کو ثابت کیا، جیسا کہ علامہ کی عادت ہے:

''وَاعْلَمْ اَنَّ الْأَدْوِيَةَ الطَّبِيْعِيَّةَ الْإِلٰهِيَّةَ تَنْفَعُ مِنَ الدَّاءِ بَعْدَ حُصُوْلِهٖ، وَتَمْنَعُ مِنْ وُقُوْعِهٖ، وَإِنْ وَقَعَ لَمْ يَقَعْ وُقُوْعًا مُضِرًّا، وَإِنْ كَانَ مُؤْذِيًا، وَالْأَدْوِيَةُ الطَّبِيْعِيَّةُ إِنَّمَا تَنْفَعُ بَعْدَ حُصُوْلِ الدَّاءِ، فَالتَّعَوُّذَاتُ وَالْأَذْكَارُ إِمَّا اَنْ تَمْنَعَ وُقُوْعَ هٰذِهِ الْأَسْبَابِ، وَإِمَّا اَنْ تَحُوْلَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ كَمَالِ تَأْثِيْرِهَا بِحَسَبِ كَمَالِ التَّعَوُّذِ وَقُوَّتِهٖ وَضَعْفِهٖ، فَالرُّقَى وَالْعُوَذُ تُسْتَعْمَلُ لِحِفْظِ الصِّحَّةِ، وَلِإِزَالَةِ الْمَرَضِ.''

(زاد المعاد، فصل في هديه في علاج لدغ العقرب بالرقية: ١٨٦/ ٤، ط: دار الكتب العلمية)

❷-علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ہی نے اپنی مشہور شہرہ آفاق کتاب ''مدارج السالکین'' میں تعوُّذات کی اہمیت و وقعت کو فوائد کی شکل میں تحریر فرمایا کہ اس آدمی پر لازم ہے جو دنیوی اور اُخروی مصائب سے اپنی حفاظت کا خواہاں ہے کہ وہ ہمہ وقت قلعہ بند اور زرہ زیبِ تن رکھے، یعنی وہ تعوُّذاتِ نبویہ کی پابندی کرے:

''فَحَقٌّ عَلٰى مَنْ اَرَادَ حِفْظَ نَفْسِهٖ وَحِمَايَتَهَا اَنْ لَّا يَزَالَ مُتَدَرِّعًا مُتَحَصِّنًا لَابِسًا اَدَاةَ الْحَرْبِ مُوَاظِبًا عَلٰى اَوْرَادِ التَّعَوُّذَاتِ وَالتَّحْصِيْنَاتِ النَّبَوِيَّةِ الَّتِيْ فِي الْقُرْآنِ وَالَّتِيْ فِي السُّنَّةِ.'' (مدارج السالكين، فصل في مشاهد الخلق في المعصية، المشهد الأول مشهد الحيوانية: ٤٠٤/ ١، ط: دار الكتاب العربي)

❸-نضرۃ النعیم میں استعاذہ کی مسلسل پابندی کے چودہ فوائد بیان کیے گئے ہیں، جن میں سے چند ہم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

۱-استعاذہ نفس کی راحت وسکون کا سبب ہے۔ ۲-استعاذہ سے اللہ پر توکل کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ ۳-استعاذہ کی دعاؤں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ ۴-استعاذہ شیطان سے بچنے کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے۔ ۵-استعاذہ سے انسان اپنے اعضاء کے شرور سے محفوظ رہتا ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

واٹس ایپ پر اجتماعی ایصالِ ثواب کے لیے گروپ بنانا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

آج کل واٹس ایپ پر گروپس ہیں، جس میں کہا جاتا ہے کہ سب مل کر مُردوں کے ایصالِ ثواب کے لیے سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنا حصہ ڈالیں، یا درود گروپس بنائے ہیں کہ سب مل کر درود جمع کریں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا جاتا ہے، برائے مہربانی یہ بتادیں کہ یہ بدعات میں شمار ہوگا یا جائز ہے؟

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

جواب سے پہلے تمہید کے طور پر چند باتیں لکھی جاتی ہیں:

❶ - دینِ اسلام میں جن اعمال کا جو درجہ ثابت ہے، انہیں اسی درجے میں رکھتے ہوئے عمل کرنا دین ہے، جو اُمور شریعت میں مباح ہیں انہیں لازم سمجھنا، بلکہ جن اعمال کا استحباب شرعًا ثابت ہو، انہیں لازم سمجھنا، یا عملاً ان کا التزام یا ان کی طرف بایں طور دعوت دینا کہ مخاطب کے لیے انکار مشکل ہوجائے، یہ اُن امور کو شرعًا ممنوع بنادیتا ہے، مثلاً: بعض احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سلام پھیرنے کے بعد نمازیوں کی طرف دائیں جانب سے متوجہ ہوتے تھے، بعض حضرات نے اسے لازم یا باعثِ فضیلت سمجھا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا:

> ’’تم میں سے کوئی بھی شیطان کے لیے اپنی نماز میں سے حصہ نہ بنائے، بایں طور کہ وہ سمجھے کہ اس پر نماز کے بعد دائیں طرف سے پھرنا لازم ہے، تحقیق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مرتبہ بائیں

جانب سے متوجہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔''

(مشكاة المصابيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، الفصل الأول، ص:۸۷، ط: قديمی، کراچی)

اس حدیث کی شرح میں ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں اس بات کی تعلیم ہے کہ جو آدمی کسی مستحب عمل پر اِصرار کرے، اور اسے لازم بنالے اور رخصت پر عمل نہ کرے، تو شیطان نے اُسے گمراہ کر دیا، (جب مستحب کے التزام پر یہ وعید ہے) تو جو شخص بدعت یا کسی منکر (شرعاً ناپسندیدہ عمل) پر اصرار کرے اس کا کیا حکم ہوگا؟ (اسی سے اندازہ کر لیجیے!)۔''

(مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، الفصل الأول، (۳/ ۳۱)، ط: مكتبه رشيديه، كوئٹه)

❷-انفرادی طور پر مُردوں اور زندوں کے لیے ایصالِ ثواب کو فقہاءِ کرام نے مستحسن لکھا ہے، اور دن، وقت یا خاص کیفیت کے التزام اور اعلان کے بغیر اتفاقی طور پر اجتماعی صورت بن جائے تو یہ بھی جائز ہے، لیکن اس کے اجتماع کے لیے اہتمام کرنا یا اجتماع کی دعوت و ترغیب دینا شرعاً مطلوب و مستحسن نہیں ہے، بلکہ التزام و اصرار، یا کسی دن یا خاص کیفیت کی قید کی وجہ سے یہی عمل بدعت بن جاتا ہے، جب کہ حسبِ توفیق و سہولت انفرادی طور پر کوئی بھی نیک عمل کر کے ایصالِ ثواب کر دینا مستحسن ہے۔

❸-نفلی عبادات اور دعا و اَذکار میں شرعاً اِخفا پسندیدہ ہے، اور عبادات کی روح اور اِخلاص کا حصول، اِظہار کی نسبت اِخفا میں زیادہ ہے، بلکہ بسا اوقات اِظہار میں ریا و نمود کا عنصر شامل ہوجاتا ہے اور عبادت کا اجر بھی ضائع ہوجاتا ہے، اور ریا کاری کے کبیرہ گناہ کی وجہ سے آدمی سخت وعید کا بھی مستحق بن سکتا ہے۔

۴-نفلی اَعمال میں باہم مقابلے کا ماحول بنا کر ان کے اظہار کی صورت میں زیادہ مقدار میں پڑھنے والوں کے دل میں کم پڑھنے والوں یا حصہ نہ لینے والوں کی تحقیر کا پہلو بھی آسکتا ہے، جو مستقل گناہ ہے۔

تمہید کے بعد مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے واٹس ایپ گروپ میں اہتمام کے ساتھ اجتماعی انداز میں سورۂ اِخلاص کا ختم کرنا اور مجموعی طور پر درود شریف وغیرہ اکٹھا کر کے ایصالِ ثواب کرنا درج ذیل وجوہات کی بنا پر شرعاً درست نہیں ہے:

①-اجتماعی ایصالِ ثواب کی ترغیب و اہتمام جو کہ شرعاً مستحسن نہیں ہے۔

②-اگر اس کا التزام ہو، اور شرکت نہ کرنے والوں کو ملامت کی جاتی ہو تو یہ قباحت مستزاد ہے، جو اِسے بدعت بنادے گا۔

③-نفل عمل کا اِظہار جو رِیا کا سبب، اور اَعمال کی روح اور اِخلاص کے خلاف ہے۔

④-شرکت نہ کرنے والوں یا کم مقدار میں پڑھنے والوں کی تحقیر یا تنقیص کا سبب بننا، جس سے عُجب اور تکبر کی راہیں کھلتی ہیں۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ایصالِ ثواب کے لیے ذکر کردہ واٹس ایپ گروپس میں حصہ ڈالنے کے بجائے ہر شخص اپنے طور پر جس قدر چاہے، کم یا زیادہ، قرآنِ کریم کی تلاوت، ذکر واَذکار اور درود شریف پڑھ کر خود ایصالِ ثواب کرسکتا ہے، نیز ایصالِ ثواب کے لیے لوگوں کو ترغیب تو دی جاسکتی ہے، مگر مجموعی طور پر درود شریف وغیرہ اکٹھا کرکے ایصالِ ثواب کی صورت درست نہیں ہے۔ مسندِ احمد میں ہے:

’’حدثنا عارم، حدثنا معتمر، عن أبيه، عن رجل، عن أبيه، عن معقل بن يسار أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:’’ البقرة سنام القرآن وذروته، نزل مع الآية منها ثمانون ملكا، واستخرجت ’’اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ‘‘ من تحت العرش، فوصلت بها، أو فوصلت بسورة البقرة، و يسٓ قلب القرآن، لا يقرؤها رجل يريد الله والدار الآخرة إلا غفر له، واقرؤوها على موتاكم.‘‘ (مسند أحمد، ج:۳۳، ص: ٤١٧، رقم الحديث: ٢٠٣٠٠، ط:مؤسسة الرسالة)

’’بدائع الصنائع‘‘ میں ہے:

’’من صام أو صلّى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات أو الأحياء جاز و يصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة.‘‘

(بدائع الصنائع، ج:٢، ص: ٢١٢، ط: دار الكتب العلمية)

’’البحر الرائق‘‘ میں ہے:

’’وأصل هٰذا أن التطوع بالجماعة إذا كان على سبيل التداعي يكره.‘‘

(البحر الرائق، ج:١، ص:٣٦٦، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وفيه أيضاً:

’’ولأن ذكر الله تعالىٰ إذا قصد به التخصيص بوقت دون وقت أو بشيء دون شيء لم يكن مشروعا حيث لم يرد الشرع به .‘‘

(بدائع الصنائع، ج:٢، ص: ١٧٢، ط: دار الكتاب الإسلامي)

’’إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام‘‘ میں ہے:

’’قد منعنا إحداث ما هو شعار في الدين. ومثالهٗ: ما أحدثته الروافض من عيد ثالث، سموه عيد الغدير. وكذلك الاجتماع وإقامة شعاره في وقت مخصوص على شيء مخصوص، لم يثبت شرعا. وقريب من ذٰلك: أن تكون

العبادة من جهة الشرع مرتبة على وجه مخصوص، فيريد بعض الناس: أن يحدث فيها أمرا آخر لم يرد به الشرع، زاعما أنهٗ يدرجه تحت عموم، فهٰذا لايستقيم؛ لأن الغالب على العبادات التعبد، ومأخذها التوقيف.‘‘

(إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام، ج:١، ص:٢٠٠، ط:مطبعة السنة المحمدية)

نبی کریم ﷺ کاارشادِگرامی ہے:

’’حدثنا أبو نعيم: حدثنا سفيان، عن سلمة قال: سمعت جندبا يقول:قال النبي صلى الله عليه وسلم ولم أسمع أحدا يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم غيره، فدنوت منه، فسمعته يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من سمع سمع الله به، ومن يرائي يرائي الله به.‘‘

(صحيح البخاري، ج:٥، ص:٢٣٨٣، رقم الحديث:٦١٣٤، ط:دار ابن كثير)

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعیدالرحمٰن	محمد انعام الحق	عبدالرحمٰن
الجواب صحیح		تخصصِ فقہِ اسلامی
محمد شفیق عارف		جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

نَقدُ و نظَر

ادارہ

احکام المعذورین (معذور اور مریض کے احکام)

تالیف: حضرت مولانا مفتی سید عبد المجید کوٹھیاوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ تحقیق وتخریج: مفتی سید انور شاہ صاحب (استاذ جامعہ بیت السلام، لنک روڈ، کراچی)۔ صفحات: ۴۲۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: Vinco Medical University, Karachi۔ رابطہ نمبر: 0332-2572867

زیرِ تبصرہ کتاب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت حضرت مولانا مفتی سید عبد المجید صاحب کوٹھیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے، جو دار العلوم دیوبند کے قدیم فاضل تھے، سنِ فراغت ۵۰-۱۳۵۱ھ ہے۔ وفات ۱۳۷۴ھ میں ہے۔ آپ رحمہ اللہ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ آپ خود کافی عرصہ مریض اور معذور رہے، چنانچہ مرض اور معذوری کے دوران اسی موضوع پر تالیف بھی فرمائی۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر ماہنامہ بینات کے سابق مدیر شہیدِ ناموسِ رسالت حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ماہنامہ بینات میں تبصرہ فرمایا تھا، جس کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> ’’کتاب میں ماشاء اللہ طہارتِ معذور سے لے کر معذور کی نماز، جماعت، جمعہ، عیدین، معذور کا غسل میت، کفن، دفن، نمازِ جنازہ، زکاۃ، نکاح، ہجرت اور مسائلِ شتیٰ کے عنوان سے تقریباً سارے ہی مسائل کو نہایت مدلل اور سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ کتاب کے حاشیہ میں حوالہ کے لیے فقہی حوالہ جات کی تصریحات اور ماخذ کے من وعن اقتباسات نے کتاب کی اہمیت اور ثقاہت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔‘‘

اب یہ کتاب مفتی سید انور شاہ صاحب کی طرف سے مزید تحقیق وتخریج، مقدمہ اور مسائل وعنوانات کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ فہرست میں آٹھ سو سے زائد عنوانات درج ہیں، جس سے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب ادنیٰ کاغذ پر کارڈ کور میں شائع کی گئی ہے۔ دورانِ مطالعہ املاء کی کافی غلطیاں نظر سے گزریں اور علاماتِ ترقیم کی درستگی کا خاص اہتمام نہیں ہے۔ فقہی حوالہ جات میں جلد اور صفحات نمبر درج ہیں، مگر طبع نہیں لکھا گیا، طبع نہ لکھنے کی وجہ سے کتاب کے مطلوبہ مقام تک رسائی میں مشکل پیش آتی ہے۔ اُمید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں یہ خامیاں دور کی جائیں گی۔